سلیم قادری

فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ادارہ منہاج القرآن
۳۶۵- ایم ماڈل ٹاؤن- لاہور

فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ادارہ منہاج القرآن
۳۶۵- ایم ماڈل ٹاؤن- لاہور

30/ii/87
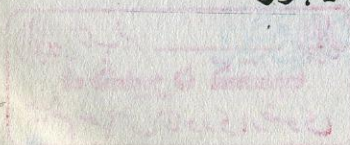
صفحہ 86 حضورؐ کو بھی یہ اختیار نہیں کہ کسی پر اپنی رائے مسلط کر سکیں
صفحہ 111 بریلویت دیوبندیت سے وحشت

نام کتاب ــــــــ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے ؟

خطبات ــــــــ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تدوین ــــــــ جاوید القادری ، ضیاء اللہ نیّر

اشاعت بار اوّل ــــــــ جنوری ۱۹۸۵ء

تعداد ــــــــ ۲ ہزار

اشاعت بار دوم ــــــــ فروری ۱۹۸۶ء

تعداد ــــــــ ۳ ہزار

طابع ــــــــ المطبعۃ العربیہ، لاہور

ٹائٹل ــــــــ یوسف نظامی

قیمت ــــــــ ۱۲ روپے

نوٹ : پروفیسر صاحب کی تمام تصانیف اور خطابات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونیوالی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے ادارہ منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

جاوید القادری

ناظم شعبہ نشر و اشاعت

مولائے صلِّ وسلِّم دائماً أبداً

علیٰ حبیبک خیرِ الخلقِ کلِّھِم

محمّدٌ سیّدُ الکونینِ والثقلینِ

والفریقینِ من عُربٍ ومن عجمِ

صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلّم

حکومت پنجاب کے مراسلہ نمبر

NO. S-O. (P.I.) 4-1/80. P-IV. 31st July 1984

کے مطابق ہماری تمام کتب پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کیلئے

سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں۔

فہرست

نابغۂ عصر

ایک شخصیت جس نے تمام متداولہ دینی علوم و فنون مثلاً قرآن و حدیث، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، تصوف و طریقت، طبِ مغربی اور طبِ مشرقی اور عربی، فارسی اور اُردو ادب کی تکمیل کے لیے دُور دراز کے سفر کیے، اسے تحصیل علم و عرفان کا ذوق جھنگ سے لکھنؤ، حیدر آباد دکن، دہلی، شام، شرقِ اردن، بغداد اور مدینہ منورہ تک لے گیا۔ اس کے دل و دماغ پر اُمتِ مسلمہ کے سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی زوال و ابتلا کا گہرا اثر تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اُمت کے عروقِ مردہ میں نئی زندگی پیدا ہو، اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام دنیا میں برگ و بار پیدا کرے اور قرآنی تعلیمات کے ذریعے فکری و عملی انقلاب کی ایسی راہ ہموار کی جائے جس کے اثرات انمٹ ہوں اور برکات لامتناہی۔

اس شخصیت نے ملی منفعت کو ذاتی معاملات پر ہمیشہ مقدم رکھا تھا اور خواہشات کا سائبان ہمیشہ اجتماعی بھلائی کے لیے تانا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو دین کی تبلیغ اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ جب اس عظیم شخصیت نے مقامِ ملتزم (خانہ کعبہ) پر کھڑے ہو کر زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ذات کے حوالے سے کچھ مانگا تو اُس میں بھی دنیائے اسلام ہی کی بہتری کا خیال کارفرما تھا۔ اس نے بارگاہِ خداوندی میں اپنا درد پیش کیا تو اس کے علاج میں بھی مسلمانوں کے اجتماعی دُکھوں کا مداوا چاہا۔ اس نے اپنی خواہش کو زبان دی تو وہ بھی اسلام ہی کے احیاء و فروغ کی دُعا بن گئی۔ یہ تھے حضرت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ جنہیں ۱۹۴۸ء میں سرزمینِ بغداد و نجف کی زیارت کے بعد حرمِ کعبہ اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کا پہلا موقع نصیب ہوا تھا۔ رات کے پچھلے پہر میں طوافِ کعبہ کے بعد مقامِ ملتزم پر غلافِ کعبہ کو تھامتے ہوئے آنسوؤں کی برسات میں ان کی زبان سے یہ دُعا نکل رہی تھی۔

"باری تعالیٰ ایسا بچہ عطا کر، جو تیری اور تیرے دین کی معرفت کا حامل ہو، جو دنیا اور آخرت میں تیری بے پناہ عطا و رضا کا حقدار ٹھہرے اور فیضانِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بہرہ ور ہو کر دُنیائے اسلام میں ایسے علمی و فکری اور اخلاقی و روحانی انقلاب کا داعی ہو، جس سے ایک عالم متمتع ہو سکے۔"

دل کی گہرائیوں سے برآمد ہونے والی اس دُعا کے نتیجے میں خود فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طاہر کے تولد کی بشارت دی۔ حضورؐ کا کرم تو ان پر پہلی بار نہیں ہُوا تھا مگر کرم کی یہ صورت بے نظیر تھی کہ قبولیتِ دُعا کی خوشخبری دی اور نام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تجویز فرمایا۔ اس لطف و عنایت پر سائل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ "طاہر جونہی سنِ شعور کو پہنچے گا اسے آپؐ کی خدمت میں پیش کردوں گا۔"

والدِ گرامی

حضرت علامہ فریدالدین قادریؒ ۱۹۱۸ء میں جھنگ میں پیدا ہُوئے۔ ابتدائی تعلیم پہلے جھنگ میں اور بعد میں سیالکوٹ میں حاصل کی۔ دین و ادب اور طبّ کی ساری تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ طبیہ کالج لکھنؤ میں شفاالملک حکیم عبدالحلیم لکھنوی اور دہلی میں حکیم نابینا انصاری سے تلمذ رہا، لکھنؤ، حیدر آباد دکن اور دہلی سے طبِ یونانی میں تخصص کیا۔ لکھنؤ میں ہی شکیل مینائی سے اُردو ادب اور شاعری میں استفادہ کرتے رہے۔ اور دینی علوم کی تکمیل دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے کی۔

ڈاکٹر صاحبؒ عدیم المثال خطیب، بلند پایہ عالمِ دین اور جلیل القدر طبیب تھے۔ تصوّف اور روحانیت سے خصوصی شغف تھا۔ بغداد شریف میں نقیب الاشراف سیدنا شیخ ابراہیم سیف الدین الگیلانیؒ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ برصغیر میں فقیہہ اعظم مولانا محمد یوسف سیالکوٹی، شیخ الحدیث حضرت مولانا سردار احمد محدّث لائلپوری اور حضرت مولانا ابوالبرکات سیّد احمد قادریؒ (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے اکتسابِ علم کیا۔ علاوہ ازیں بغداد اور دمشق (شام) کے جلیل القدر علماء سے بھی کسبِ فیض کیا۔ بالخصوص شیخ محمد المکی الکتانیؒ رئیس رابطہ علماء شام سے شیخ اکبر کی فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیّہ کا درس لیا۔ مدینہ طیبہ میں مولانا عبدالشکور المہاجر المدنیؒ سے آپ کو حدیث میں خصوصی تلمّذ تھا۔ آپ کی وفات ۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو جھنگ صدر میں ہوئی۔

علامہ فریدالدین قادریؒ کو مقامِ ملتزم پر جو بشارت دی گئی تھی، ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء کو اس کی عملی شکل نے جنم لیا۔ آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہُوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "**طاہر**" فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کا اضافہ کرکے "محمد طاہر" نام رکھا۔

تعلیمی زندگی

محمد طاہر نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز سیکرڈ ہارٹ سکول جھنگ صدر سے کیا۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام امتحانات اعلیٰ فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ ایم اے (اسلامیات) میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا تو علامہ فریدالدین قادری نے خصوصی توجہات کے ساتھ بے پناہ شفقت کے زیرِ اثر تربیّت کی۔ ۱۹۷۴ء میں تمام دینی اور دُنیوی علوم کی تکمیل ہوگئی۔ تربیّت کی بنیادی جہتیں مکمل ہوگئیں تو ۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو والدِ گرامی کا وصال ہوگیا۔ محمّد طاہر جو ۱۹۶۶ء میں حضرت سیّدنا الشیخ طاہر علاؤالدین الگیلانی القادری مدظلہٗ سے رُوحانی نسبت کے باعث محمد طاہر القادری ہوگئے تھے، ان کی عملی زندگی اُن کے والدِ گرامی نہ دیکھ سکے۔

جناب محمد طاہر القادری نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (اسلامیات) کے بعد ایل ایل بی کیا۔ پنجاب پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہوکر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں گورنمنٹ کالج عیسیٰ خیل (ضلع میانوالی) میں اسلامیات کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس سے پہلے گورنمنٹ کالج جھنگ میں چھ ماہ تک علوم اسلامیہ کے عارضی استاد کی حیثیت سے پڑھاتے رہے تھے۔

دو چھوٹے بھائیوں اور ہمشیرگان کی موجودگی میں تمام گھریلو ذمہ داریاں آپ کے سر آپڑی تھیں۔ آپ نے جھنگ یا گردو نواح میں ٹرانسفر کی کوشش کی تو اس مقصد کے لیے رشوت طلب کی گئی جو آپ کے مزاج کے منافی اور تربیت کے خلاف تھی۔ چنانچہ آپ محکمہ تعلیم کی ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور دو سال تک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے جھنگ میں پریکٹس کرتے رہے۔

محترم محمد طاہر القادری شروع سے ہی جس مقصد کو متاعِ حیات سمجھتے تھے وہ ایسا ہمہ گیر اسلامی انقلاب ہے جس سے پورا عالم اسلام متحد اور منظم ہوکر "مسلم بلاک" کی صُورت اختیار کرلے اور حق کی خاطر طاغوتی اور استحصالی طاقتوں سے ٹکرا کر اپنا کھویا ہُوا وقار بحال کراسکے۔ آپ کے چھوٹے بھائی محمد جاوید قادری نے قرآنِ پاک پر حلف اٹھایا تھا کہ اس مقصد میں اپنے بھائی کے دست و بازو بنیں گے۔ مگر انہوں نے اپنے جلیل القدر والدؒ کے ارتحال کے ڈیڑھ سال بعد بطور ایسوسی ایٹ انجینئر اپنی تعلیم مکمل کی ہی تھی کہ نتیجے سے پہلے ان کا وصال ہوگیا۔ محمّد طاہر القادری آج تک راہ حق کی منزلوں میں بادیہ پیمائی کے دوران اس پُرعزم بھائی کی کمی محسوس کرتے ہیں۔

تمام گھریلو معاملات اور ہمشیرگان کی شادیوں سے فراغت کے بعد اپریل ۱۹۷۸ء میں آپ اسلامک لاء کے لیکچرار کے طور پر یونیورسٹی لاء کالج لاہور کے ساتھ منسلک ہوگئے اور طلبا کو اپنی خداداد صلاحیتوں اور علم و دانش سے مستفید کرنے لگے۔ آپ کی باقاعدہ تعلیمی تکمیل کا آخری مرحلہ اسلامک لاء میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) تھا جس کا تحقیقی کام آپ نے "PUNISHMENTS IN ISLAM, THEIR CLASSIFICATION AND PHILOSOPHY" کے زیرِ عنوان پنجاب یونیورسٹی کو پیش کیا۔ جس پر یونیورسٹی نے اپریل ۱۹۸۶ء میں آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی ہے۔

بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری

جناب محمد طاہر القادری آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے کہ والدین کی معیت میں حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ منوّرہ سے مشرف ہوئے۔ حرمین شریفین کی یہ حاضری معمولی حاضری نہ تھی بلکہ سرکارِ دوجہاں نے خود ان کے والدِ گرامی کو خواب میں حکم دیا تھا کہ طاہر کو ہمارے پاس لاؤ۔" اس ارشاد کی تعمیل میں ۱۹۶۳ء میں انہیں بارگاہِ رسالت مآبؐ میں پیش کیا گیا اور اس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انھیں خود بلا کر اپنے لطف و کرم اور خصوصی فیضان سے نوازا۔

محمد طاہر نامی اس تیرہ سالہ نوجوان کی بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ حاضری کس قدر عجیب تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بلاوے کا مقصد پورا ہونے کی بشارت بھی خود ہی مرحمت فرمادی۔

"محمد طاہر کو دُودھ کا بھرا ہوا ایک مٹکا عطا کیا اور اسے ہر ایک میں تقسیم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔"
یہ حاضری کی مکمل قبولیت اور اپنی خصوصی عنایات و نوازشات کی خوشخبری تھی۔

دینی تعلیم

مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں جناب محمد طاہر القادری کو عالمِ اسلام کی معروف رُوحانی شخصیت جناب مولانا ضیاء الدین قادری مہاجر مدنی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں تبرکاً زانوے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا اور وہیں سے آپ کی دینی تعلیم کا آغاز ہُوا۔ آپ نے صَرف، نحو، فقہ، اصُول فقہ، منطق، فلسفہ، معانی اور عربی ادب کی ابتدائی کتب اپنے والدِ محترم سے پڑھیں۔ اس کے بعد جامعہ قطبیہ رضویہ جھنگ میں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک مختلف اوقات میں استاذ العلماء حضرت علامہ عبدالرشید رضوی مدظلہ سے اکتسابِ علم کیا۔ مولانا عبدالرشید رضوی دوپہر اور عصر کے مختصر وقفوں کے ساتھ صبح تین بجے سے رات گیارہ بجے تک آپ کو پڑھاتے تھے۔ محمد طاہر القادری کی تعلیم و تدریس کے دوران وہ تمام دوسرے طلبا کے اسباق معطل اور دیگر مصروفیات ترک کر دیتے تھے۔ روزانہ ۸، ۹ فنون کے اسباق ہوتے تھے۔

موقوف علیہ تک فقہ، حدیث، تفسیر اور معقولات و منقولات کے جُملہ فنون میں درسِ نظامی کی تعلیم کے بعد علومِ دینیہ متداولہ کی تکمیل اور دورۂ حدیث آپ نے اپنے والدِ معظم" سے کیا۔ درسیات کے جُملہ فنون انہی دونوں گرامی قدر اساتذہ سے پڑھے۔ مدینہ طیبہ میں کے قیام کے دوران میں مدرسۃ العلوم الشرعیہ میں والدِ گرامی کی معرفت بھی کچھ اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ بعد ازاں لاہور کے زمانۂ قیام میں حضرت علّامہ ابوالبرکات سیّد احمد قادری کے درسِ حدیث میں بھی شریک ہوتے رہے۔ پاکستان کے نامور عالمِ دین، غزالیٔ دوراں حضرت سیّد احمد سعید کاظمی مدظلہٗ نے پروفیسر صاحب کی دینی قابلیت اور علمی استعداد و بصیرت کے پیشِ نظر طریقۂ مُحدثین پر آپ کو سندِ حدیث عطا کی۔ آپ نے اسلامی فلسفہ مفکرِ اسلام حضرت ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مدظلہٗ سے پڑھا۔ اُن سے خصوصی تلمذ اور اکتسابِ فیض نے آپ کی فکری اور نظریاتی جہتوں کے تعین میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

رُوحانی فیض

مسنون استخارے کے نتیجے میں جناب محمد طاہر القادری نے حضور سیّدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی رُوحانی ہدایت پر ۱۹۶۶ء میں حضرت سیّدنا الشیخ طاہر علاء الدین الگیلانی القادری مدظلہٗ (جو سیّدنا غوثِ اعظمؓ کی اولادِ اطہار کے نقباء بغداد میں سے ہیں) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی اور حضرت کی بے پایاں نوازشات اور توجہات سے اپنی رُوحانی تکمیل کا سامان کیا۔ آپ کو اپنے گرامی منزلت مُرشد سے جتنی عقیدت ہے اُس کے مظاہر سے آپ کے ملنے والے بخوبی واقف ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی، علمی اور رُوحانی زندگی میں آپ کے شیخ طریقت مدظلہ العالی کی بے پایاں شفقت و عنایت اور خصوصی توجہات کا بڑا دخل ہے۔ بچپن سے آپ کے والدِ گرامی نے آپ کی تربیت ہی اس نہج پر کی تھی کہ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور سرکارِ غوثیت مآبؓ سے آپ کا قلبی تعلق اور روحانی نسبت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے۔ چنانچہ آپ ہمیشہ تشکر و امتنان کے طور پر اس امر کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ مجھے اپنی زندگی میں

اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم اور لطف و احسان کے جس قدر بھی مظاہر دکھائی دیتے ہیں بلاشک و شبہ انہی نسبتوں کا صدقہ ہیں۔

قومی و ملی خدمات

پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے منسلک ہونے کے بعد آپ بہت جلد یونیورسٹی سنڈیکیٹ سینیٹ اور اکیڈمک کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اس طرح آپ نے ان اداروں میں بھی یونیورسٹی کے اساتذہ طلباء اور انتظامی عملے کے دلوں میں نمایاں جگہ پیدا کر لی اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

اسی اثنا میں مرکزی وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان نے آپ کو قومی کمیٹی برائے نصاباتِ اسلامی میں بطور ایکسپرٹ EXPERT نامزد کیا۔ جس میں آپ تاحال خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے آپ کو وفاقی شرعی عدالت پاکستان کا مشیر JURIS CONSULT بھی مقرر کیا۔ چنانچہ یہ عدالت بڑے اہم اور نازک مسائل میں آپ سے رہنمائی حاصل کر رہی ہے۔ جب وفاقی شرعی عدالت پاکستان نے ۱۹۷۹ء میں رجم کے حد ہونے سے انکار پر مبنی فیصلہ دیا تو حکومتِ پاکستان نے نظرِ ثانی کی اپیل کی۔ اس مرحلے پر پروفیسر محمد طاہر القادری نے مسلسل تین دن تک اس موضوع پر نہایت مدلّل بحث کی اور سینکڑوں دلائل کے ساتھ رجم کا حد ہونا ثابت کیا۔ نتیجۃً وفاقی شرعی عدالت نے مورخہ ۲۰ جُون ۱۹۸۲ء کو اپنا فیصلہ واپس لیتے ہوئے رجم کو حد تسلیم کر لیا۔ عدالت کا تفصیلی فیصلہ پی ایل ڈی ۱۹۸۳ء وفاقی شرعی عدالت صفحہ ۲۵۵ تا ۴۰۸ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ عدالت کے فاضل جج صاحبان نے اپنے فیصلے میں متعدد مقامات پر پروفیسر صاحب کی قابلِ قدر معاونت پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

اسی طرح جولائی، اگست ۱۹۸۴ء میں حکومتِ پاکستان کے خلاف قادیانیوں کی طرف سے دائر کردہ درخواست کی سماعت کے دوران اسلام میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق اور ان کی مذہبی آزادی کی حدود کے موضوع پر قرآن و سنّت کے بے شمار دلائل پر مشتمل آپ کی شاندار علمی بحث بھی تاریخی اہمیت کی حامل تھی جس کے نتیجے میں وفاقی شرعی عدالت پاکستان نے قادیانیوں کی درخواست مورخہ ۸۴-۱۰-۲۰ کو خارج کر دی اور فلسفۂ ختمِ نبوّت کی قانونی اہمیت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو گئی۔ فاضل عدالت کے فیصلے کی تفصیلات پی ایل ڈی ۱۹۸۵ء وفاقی شرعی عدالت صفحات ۸ تا ۱۲۰ ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

مزید برآں نومبر ۱۹۸۵ء میں وفاقی شرعی عدالت پاکستان میں توہینِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتکب کیلئے سزا کے تعین کے انتہائی نازک اور اہم قانونی مسئلے پر پروفیسر صاحب نے ۱۴ نومبر تا ۱۷ نومبر ۱۹۸۵ء مسلسل تین روز تک عدالت میں دلائل دیئے۔ جس میں آپ نے قرآن و سنّت کے واضح دلائل سے یہ ثابت کیا کہ توہینِ رسالت کے مرتکب کی سزا "موت" ہے۔ اور یہ سزا بطورِ حد واجب ہوگی۔ توہینِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارتکاب ایسا بدترین جرم ہے جسے بالواسطہ یا بلاواسطہ، ارادی یا غیر ارادی طور پر کسی صورت اور کسی درجے میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ گستاخِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کی توبہ بھی اسے سزائے موت کے نفاذ سے مستثنیٰ نہیں کر سکتی۔ پروفیسر صاحب نے سینکڑوں دلائل کے ذریعے اس امر پر زور دیا کہ اسلامی ریاست کے قانون میں کوئی ایسی گنجائش نہیں رہنے دی جانی

چاہیئے جس سے کسی سطح پر بھی گستاخئ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رُجحان راہ پا سکے۔ عظمتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں پروفیسر صاحب نے جس دل سوزی، کمال وارفتگی اور عشقِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مملو عدالت میں اپنے باطل شکن اور ایمان افروز دلائل پیش کئے ان کی یاد سے عدالت کے درو دیوار صدیوں معمور رہیں گے۔

۱۹۸۲ء کے اوائل میں حکومتِ پاکستان نے "اپیلٹ شریعت بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان قائم کیا۔ پروفیسر محمد طاہر القادری کو اس میں بھی مشیرِ فقہ JURIS CONSULT مقرر کیا گیا۔ آپ دیگر مصروفیات کے باوجود تاحال ان امُور میں قومی اور ملی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

آپ کی ان قومی و ملی خدمات کے اعتراف کے طور پر کئی قومی اداروں اور تنظیموں نے آپ کو اعزازی تمغے بھی پیش کئے۔ مثلاً طبیہ کالج لاہور کی طرف سے "قریشی گولڈ میڈل" اور ادارۂ ثقافتِ پاکستان کی طرف سے "تمغۂ ثقافت" وغیرہ۔ یاد رہے کہ آپ کو زمانۂ طالب علمی میں بھی نمایاں علمی، تحقیقی اور تقریری خدمات کے اعتراف میں طلائی تمغے ملتے رہے ہیں جن میں "پنجاب یونیورسٹی گولڈ میڈل" اور "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پاکستان کی طرف سے طلائی تمغۂ قائد اعظم" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

یوں تو پروفیسر صاحب اندرون اور بیرونِ ملک عالمی سطح کی متعدد کانفرنسوں اور کانگرسوں میں شرکت کر چکے ہیں لیکن ماہ نومبر ۱۹۸۵ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے زیرِ اہتمام انٹرنیشنل قرآن کانگریس اور وفاقی حکومت کے تحت ہونے والی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس اسلام آباد میں شرکت کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے تحت ہونے والی انٹرنیشنل قرآن کانگریس میں دنیا بھر سے دانشور اور علماء شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہُوئے پروفیسر صاحب نے اپنے انگریزی خطاب میں قرآنی تصورِ ہدایت (QURANIC CONCEPT OF GUIDANCE) پر گفتگو کی۔ جس سے پُورے ایوان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور جب خطاب ختم ہوا تو تمام مندوبین (جن میں سے ہر شخص عالمی شہرت کا حامل دانشور تھا) والہانہ طور پر پروفیسر صاحب سے ملے۔ انھوں نے انتہائی محبت بھرے انداز میں داد و تحسین پیش کی اور قرآن فہمی میں پاکستان کے نمایاں مقام کا اعتراف کیا۔ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ سے آئے ہوئے ایک وفد کے سربراہ اور مصری محقق پروفیسر عبدہٗ الخولی جو NORTHERN ILLINOIS UNIVERSITY میں سوشیالوجی کے پروفیسر ہیں، پروفیسر صاحب کے پاس آئے اور انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں قرآن کے تصورِ احسان پر ایک عرصہ سے تحقیق کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے عالمِ اسلام کے نامور علماً اور محققین سے رابطہ قائم کیا ہے لیکن آج تک مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔ آج اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے خطاب سے مجھ پر قرآن کا تصورِ احسان منکشف ہو گیا ہے اور میری زندگی بھر کی پیاس بجھ گئی ہے۔ یہ کہتے ہوئے موصوف نے پروفیسر صاحب کو "NORTHERN ILLINOIS UNIVERSITY" کی طرف سے فُل پروفیسر شپ کی پیشکش کر دی اور کہا کہ یہ

ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا اگر آپ ہماری پیش کش قبول کریں۔ پروفیسر صاحب نے ان پر واضح کر دیا کہ وہ احیائے اسلام کے عالمگیر مشن کے لیے مصروفِ عمل ہیں لہٰذا وہ اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک اس نوعیت کی کوئی مستقل پیشکش قبول نہیں کر سکتے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ پھر ایک سال کے عرصے کے لیے ہی ہمارے پاس آ جایئے تاکہ ہماری یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہو جائے کہ آپ جیسے مقام و مرتبہ کا سکالر یہاں کے سٹاف میں شامل رہا ہے پروفیسر صاحب نے اس پر بھی اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اُن کے مسلسل اصرار پر بالآخر یہ طے پایا کہ پروفیسر صاحب کسی وقت مختصر دورانیے کے لیے امریکہ تشریف لے جائیں گے اور مذکورہ یونیورسٹی کے VISITING LECTURER کے طور پر لیکچر دیں گے۔ اس سے زیادہ وقت نکالنا ممکن نہیں۔

مرکزی ادارہ منہاج القرآن کا قیام

پروفیسر محمد طاہر القادری نے ۱۹۷۶ء میں محاذِ حریت کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اُن دنوں آپ جھنگ ڈسٹرکٹ کورٹ میں وکالت کر رہے تھے۔ اس تنظیم کے تحت دو سال تک سہ روزہ درسِ قرآن، نوجوانوں کی فکری اور نظریاتی تربیت اور علمی و فکری مجالس کا انعقاد ہوتا رہا اور محاذِ حریت کے چیئرمین جناب محمد طاہر القادری مختلف دینی موضوعات پر خطاب فرماتے رہے۔ ۱۹۷۸ء میں محاذ کے ارکان نے فیصلہ کیا کہ قرآن و سنت پر مبنی انقلابی فکر کی وسیع تر اشاعت کے لیے قادری صاحب لاہور منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ آپ لاہور منتقل ہو کر پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے بطور لیکچرار منسلک ہو گئے۔ کوئٹہ سے پشاور اور کراچی سے آزاد کشمیر تک تبلیغی دورے کئے۔ لوگوں کے دلوں کو عشقِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن سے بہرہ ور کیا۔ اسلام کے احیاء کے لیے اذہان و قلوب کی زمین کو ہموار کرنا شروع کیا اور اسلام کے فکری اور عملی انقلاب کی جدوجہد کو عوام و خواص کی طلب بنا دینے کی فصل بو دی۔ اس ابتدائی کام کے بعد غلبۂ دینِ حق کی بحالی اور اُمّتِ مسلمہ کے احیاء و اتحاد کے لیے اسلامی انقلاب کی عالمگیر جدوجہد کی خاطر آپ نے بعض دوستوں کے تعاون سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو مرکزی ادارہ منہاج القرآن کی بنیاد رکھی، ہر سطح پر باطل، طاغوتی استحصالی قوتوں اور ان کے اثر و نفوذ کے خاتمے کے لیے تگ و دو اس ادارے کا بنیادی مقصد قرار پائی۔

یہاں تحدیثِ نعمت کے طور پر ایک اور حقیقت کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ مرکزی ادارہ منہاج القرآن کے سیکرٹریٹ میں جب سے دفتری کام کا آغاز ہوا ہے اس میں زیرِ تکمیل لائبریری سے استفادے کا آغاز ہی عظمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور ناموسِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کے سلسلے میں ورق گردانی سے ہُوا ہے جس کی ضرورت مذکورہ بالا وفاقی شرعی عدالت کے مقدمہ کے سلسلے میں پیش آئی اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ادارے کے قیام کا مقصد ہی عظمتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تحفظ اور عشق و اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و اشاعت ہے۔ خود پروفیسر صاحب کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بھی اسی عظیم مقصد کے لیے وقف ہے۔

جب سے آپ نے لاہور اور کراچی تا پشاور پورے مُلک میں اپنے دُروس و خطابات کے ذریعے عشق و اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فروغ کی تحریک کا آغاز کیا ہے لاکھوں افراد کے بدلتے ہوئے احوال

دینی مجالس و محافل کی بحال ہوتی ہوئی رونقیں جذب و شوق اور کیف و مستی کی لوٹتی ہوئی یادیں روشن دن کی طرح اس حقیقت کی کھلی تصدیق کر رہی ہیں۔ ہر آنکھ اس امر کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ ہر کان اس آواز کو سن رہا ہے اور ہر دل اس کیفیت کو محسوس کر رہا ہے۔ کوئی اس انقلاب کی آمد آمد کو پسند کرے یا ناپسند لیکن بفضلہٖ تعالیٰ صورتِ حال اب اتنی نکھر چکی ہے کہ اس واقعہ کا انکار ممکن نہیں رہا۔ بقول شخصے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ ماضی کی اس یادِ رفتہ کو تازہ کرنا بھی ادارہ منہاج القرآن ہی کا مقدر ٹھہرا۔ بے شک یہی اس کا نعرہ ہے۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے ؎
دہر میں اسمِ محمد سے اُجالا کر دے

دینی تبلیغی اور علمی خدمات

سلسلۂ درسِ قرآن : مرکزی ادارہ منہاج القرآن کے زیرِ انتظام آپ نے ۱۹۸۰ء کے اواخر میں باقاعدہ سلسلہ وار درسِ قرآن کا آغاز کیا۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں عوام و خواص اور اہلِ علم لاہور بلکہ پنجاب بھر سے شرکت کرتے ہیں۔ اس طرح قرآنی تعلیمات کا پیغام ممکنہ حد تک مخلوق خدا تک پہنچ رہا ہے ساتھ ہی منہاج القرآن کے نام سے آپ کی زیرِ تالیف تفسیرِ قرآن کی سلسلہ وار اقساط عوام میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ بھی اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک شائقین کے علمی استفادہ کا باعث بن رہی ہیں۔

سلسلہ درسِ تصوّف : مرکزی ادارہ منہاج القرآن ہی کے زیرِ انتظام آپ نے ۱۹۸۳ء میں باقاعدہ سلسلہ وار درسِ تصوّف کا آغاز کیا جس کے ذریعے عوام و خواص، نوجوانانِ ملت، علماء و فضلاء، اساتذہ و مشائخ، تاجر، صنعتکار اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں افراد مستقل طور پر اپنی اخلاقی اور روحانی تربیت کا سامان کر رہے ہیں۔ اس طرح قادری صاحب کا تبلیغی و اصلاحی کام نہ صرف علمی بلکہ عملی اور روحانی اعتبار سے بھی قابلِ دید نتائج پیدا کر رہا ہے۔

سلسلہ خطبہ جمعہ : آپ نے جامع مسجد اتفاق کالونی" ماڈل ٹاؤن لاہور میں ۱۹۸۲ء کے اوائل میں باقاعدگی سے سلسلہ وار خطبۂ جمعہ کا آغاز کیا۔ جس کے فوراً بعد دیکھتے ہی دیکھتے سامعین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ پنجاب اور مختلف اضلاع بلکہ پاکستان کے مختلف گوشوں سے ہزاروں افراد خطبۂ جمعہ سننے اور اپنے ایمان و عمل کی تازگی کا سامان حاصل کرنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔ اہلِ ذوق کا یہ رونق اللہ کے کرم سے مسلسل روز افزوں ہے۔

اس طرح مذکورہ بالا ان تینوں مراکز سے ہزاروں فرزندانِ توحید بفضلہٖ تعالیٰ ایمان و استقامت، محبت و خشیتِ الٰہی عشق و اطاعتِ رسولؐ، درد و سوز، کیف و مستی، عبادات و معاملات کی اصلاح، تزکیۂ نفس، جلائے باطن تہذیبِ اخلاق

ایثار و قربانی، اخلاص اور حسنِ عمل کی دولت سے خود کو بہرہ ور کر رہے ہیں۔

کثیر تعداد میں افراد کی یہ ذہنی اور عملی تبدیلی کسی وقت ضرور انشاء اللہ معاشرے میں اسلامی اقدار کی بحالی کا سبب ثابت ہوگی۔ مزید برآں پاکستان ٹیلیویژن کے ذریعے ان کے درسِ قرآن کا ملک کے لاکھوں افراد تک پہنچنا، ملک کے دیگر اہم اداروں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری و غیر سرکاری دفاتر و مراکز میں آپ کے ایمان پرور اور انقلاب انگیز خطابات کا سلسلہ بھی آپ کے دینی و تبلیغی مشن کا حصہ ہے۔

کراچی، پشاور، اسلام آباد اور کوئٹہ میں درسِ قرآن کا آغاز: الحمد للہ مارچ ۸۴ء سے کراچی، مئی ۱۹۸۵ء سے اسلام آباد، دسمبر ۱۹۸۵ء سے پشاور اور جولائی ۱۹۸۶ء سے کوئٹہ میں بھی سلسلہ وار درسِ قرآن کے مراکز کا قیام عمل میں آچکا ہے جہاں آپ کی محافل درس میں ان شہروں کے علاوہ دُور دراز سے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔ یوں قرآنی فکر کے انوار ملک کے طول و عرض کو روشن کر رہے ہیں۔ اسی طرح آئندہ آپ کے پیشِ نظر آزاد کشمیر میں بھی ایسے ہی علمی تبلیغی اور تربیتی مراکز قائم کرنے کا منصوبہ ہے جس کا انشاء اللہ جلد ہی آغاز ہو جائے گا۔

خواتین کے مرکزِ درس کا قیام : معاشرے میں خواتین کے کردار کی اہمیت کے پیشِ نظر آپ نے ان کے لیے لاہور میں ایک الگ سلسلہ وار درسِ قرآن کا مرکز قائم کیا ہے جہاں کثرت کے ساتھ خواتین اسلامی تعلیمات سے اکتسابِ فیض کر کے اپنی ذہنی اور عملی تربیت کا سامان کرتی ہیں۔

جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن کا قیام

جنوری ۱۹۸۳ء میں آپ نے اتفاق برادرز (پاکستان)، کے تعاون سے ایچ بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور میں اسلامی اور عصری تعلیمات کے فروغ کے لیے" اتفاق اسلامک اکیڈمی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں میٹرک پاس طلبہ کے لیے چھ سالہ کورس کے ذریعے گریجوایشن اور قدیم و جدید تقاضوں کے مطابق درسیات (درسِ نظامی) کی تکمیل کا کام کیا جا رہا ہے۔ اب بفضلہٖ تعالیٰ تعلیم و تربیت کا یہ عظیم مرکز ماہِ اگست ۱۹۸۶ء سے جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن کے نام سے ادارہ منہاج القرآن کے تحت منتقل کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں منہاج القرآن یونیورسٹی کے منصوبے پر عملدرآمد کا آغاز بھی ہو چکا ہے جس کے لیے ابتداءً تقریباً دو سو کنال رقبے پر مشتمل قطعہ اراضی حاصل کیا جا چکا ہے۔

بیرونی ممالک میں تبلیغی خدمات

۱ دورۂ ایران

۱۹۸۲ء میں آپ حکومتِ ایران کی دعوت پر ہفتۂ وحدت کی تقریبات میں شمولیت کیلئے ایران تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے تہران، قم اور مشہدِ مقدس میں مختلف مقامات پر خطاب کیا۔ جناب آیۃ اللہ خمینی، آیۃ اللہ منتظری، آیۃ اللہ مرعشی، آیۃ اللہ گل پائیگانی، وزیر اعظم، صدرِ مملکت، حکومتِ ایران کے وزراء اور کئی دیگر اہم مذہبی و سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کی اور مختلف علمی اور ملی موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا

۲ دورۂ یورپ

بیرونِ ملک تبلیغی خدمات کے سلسلے میں آپ کا ۱۹۸۴ء کا دورۂ یورپ نمایاں طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ ناروے (اوسلو) میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس (منعقدہ جولائی ۱۹۸۴ء) میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے جہاں آپ نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مشترکہ اجتماع میں "اسلام اور عیسائیت" کے موضوع پر ایک مبسوط، مدلل اور تقابلی خطاب کیا جس سے بڑے بڑے عیسائی عالم اور مبلغ صامت و ساقط ہو گئے۔ یہ تاریخی تقریر یورپ میں دعوت و فروغِ اسلام کے لیے نہایت مؤثر ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں آپ کو ڈنمارک کے مسلمانوں نے اپنی زیرِ نگرانی ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی دعوت دی اور یہ منصوبہ اب جنوری ۱۹۸۶ء میں بحمد للہ مکمل ہو گیا ہے۔

۳۔ متحدہ عرب امارات میں ادارہ منہاج القرآن کا قیام

آپ نے ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں ابوظہبی، دوبئی، شارجہ اور دیگر عرب خلیجی ریاستوں کے بھرپور تبلیغی دورے کئے۔ جن کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے عرب امارات میں ادارہ منہاج القرآن کی بہت بڑی شاخ قائم ہو گئی ہے جو وہاں نہایت مؤثر طریقے سے احیائے اسلام اور اتحاد امت کے مشن کو آگے بڑھا رہی ہے

۴۔ ڈنمارک میں ادارہ منہاج القرآن کا قیام

جنوری ۱۹۸۶ء میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ڈنمارک میں بھی ادارہ منہاج القرآن کی شاخ قائم ہو گئی ہے۔ جس کا افتتاح پروفیسر صاحب نے ۲۵ جنوری کو کوپن ہیگن کے مقام پر کیا۔ کوپن ہیگن میں ادارہ منہاج القرآن کے تحت ایک اسلامک سنٹر کا قیام بھی عمل میں لایا جا چکا ہے جس میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی فکری و عملی تربیت کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں مذکورہ اسلامک سنٹر میں داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد ۱۵۰ کے قریب پہنچ گئی ہے جس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

۵۔ انگلستان میں مشن کا فروغ

پروفیسر صاحب نے انگلستان کا پہلا تبلیغی دورہ مئی ۱۹۸۵ء اور دوسرا جنوری ۱۹۸۶ء میں کیا۔ ان دوروں میں آپ نے لندن، مانچسٹر، برمنگھم اور بولٹن وغیرہ میں عظیم الشان اجتماعات سے خطاب کئے۔

امریکہ میں مشن کا فروغ

اسی طرح پروفیسر صاحب نے اپریل ۸۶ء میں امریکہ کا دورہ کیا جہاں انہوں نے واشنگٹن، نیویارک، شکاگو اور دیگر مقامات پر خطاب کیے جو امریکہ میں ادارے کے فروغ کے سلسلہ میں انتہائی اہم ثابت ہوئے ہیں

ایسے تمام بیرونی ممالک میں آپ کے خطبات، وڈیو کیسٹ، تصانیف اور تبلیغی لٹریچر مسلمانوں کے استفادہ کے لیے بدستور پہنچ رہا ہے اور اس سلسلے میں بیرونِ ملک رہنے والے احباب کا ادارے سے باقاعدہ رابطہ رہتا ہے

فکری ارتقاء

پروفیسر صاحب کے زمانۂ طالب علمی کی تحریری یادداشتوں کی ورق گردانی سے آپ کے فکری رجحانات اور ان کی نشوونما کے بارے میں جو مفید معلومات سامنے آئی ہیں ان کا تذکرہ کئے بغیر آپ کا تعارف مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں جب آپ نے قومی

مذہبی، معاشرتی سیاسی اور معاشی حالات پر نظر ڈالی تو ہر طرف بے یقینی، زوال، انتشار، بے انصافی اور ظلم و استحصال کا دور دورہ پایا۔ آپ نے معاشرے کی عملی زندگی میں کارفرما خود غرضانہ ذہنیت اور مفاد پرستانہ رجحانات کے اسباب و علل کا کھوج لگانا چاہا۔ یہ سوال ہر وقت آپ کے ذہن کو پریشان کرتا رہتا کہ ہم ذاتی مفاد کے تنگ حصار سے باہر کیوں نہیں نکلتے اور رویہ خود غرضی ترک کیوں نہیں کرتے۔ قومی سطح پر بے حسی کا عالم یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ذاتی اور گروہی وفاداریوں کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہماری درسگاہوں کی فضا اس قابل کیوں نہیں کہ وہ طلبہ کو فکری بلند پروازی عطا کر سکے۔ ہمارے نوجوان مذہبی و ملی تشخص اور انفرادیت کی اہمیت سے کیوں ناواقف ہیں۔ ان میں اپنے فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کو بین الاقوامی سطح پر فروغ دینے کی تڑپ کیوں نہیں؟

اُمتِ مسلمہ اجتماعی سطح پر بے مقصدی اور عیش کوشی کا شکار کیوں ہے۔ آج مسلمان اپنے اندر باطل طاغوتی اور استحصالی طاقتوں سے ٹکر لینے کی جرأت کیوں نہیں رکھتے۔ وہ غالب مغربی اقوام کی اسلام دشمنی کے منظم منصوبوں اور عالم اسلام کو ذلیل و رسوا کرنے کی سازشوں سے بے خبر کیوں ہیں؟!

ملتِ اسلامیہ کے موجودہ عالمگیر زوال کو از سرِ نو عزت و عظمت میں کیونکر بدلا جا سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

غرضیکہ اس نوعیت کے ان گنت سوالات تھے جو پروفیسر صاحب کے ذہنِ رسا کو ہمہ وقت اپنی جانب متوجہ کرتے رہتے تھے۔ ملتِ اسلامیہ کے احیا اور دینِ حق کی نشاۃ ثانیہ کی اس تڑپ نے آپ کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ جس معاشرے میں اسلامی اقدار اور اخلاقی فضائل کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہو وہاں ہر فرد اپنے جائز مفادات کو بھی خود غرضانہ اور منفی طرزِ عمل سے پورا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لہٰذا جب تک سارا نظامِ معاشرت یکسر بدل کر اس نہج پر نہ آ جائے کہ خود غرضی اور بددیانتی کے ترک کرنے سے ہر فرد کے جائز حقوق اور مفادات از خود پورے ہونے لگیں اور دیانتداری زندگی کی دوڑ میں ناکامی کا باعث نہ رہے۔ اس وقت تک کوئی بھی ذاتی مفاد کے تنگ حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ بصورتِ دیگر اس خود غرضانہ معاشرے میں کسی کو کسی سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص ایثار و قربانی اور نفع بخشی و فیض رسانی کا رویہ اپنانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ نتیجۃً معاشرے میں ہمیشہ اخوت و محبت کا یوں ہی فقدان رہے گا۔ معاشرہ غیر فطری حد تک معاشی تفاوت کا شکار رہے گا۔ اخلاقی قدریں مٹتی رہیں گی۔ بلکہ زندگی میں منفی اور غیر اخلاقی قدروں کو رفتہ رفتہ تقویت اور فروغ ملتا رہے گا۔ جب دینی اور روحانی اقدار کی گرفت زندگی پر باقی نہ رہے گی تو کچھ لوگ عیش و عشرت کے باعث اخلاق و مذہب سے دور ہو جائیں گے۔ کچھ معاشی پریشانیوں کے باعث اور کچھ آزاد روی و آزاد خیالی کے باعث۔ یوں معاشرہ مکمل طور پر لادینیت کی لپیٹ میں چلا جائے گا۔

آپ نے محسوس کیا کہ مذکورہ بالا منطقی عمل ہمارے معاشرے میں گزشتہ کئی برس سے جاری ہے اور بدقسمتی سے ہماری قیادت ان تباہ کن رجحانات سے جنگ کے لیے تیار نہیں ہے جب کہ یہ کام ایک ہمہ گیر انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ آپ نے اسلام کا ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک کی حیثیت سے مطالعہ شروع کیا۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ

نے اسلامی لٹریچر کو کھنگالا تو یہ دیکھ کر از حد تعجب ہُوا کہ بیشک اسلام کو ایک جامع اور مکمل نظامِ حیات کے طور پر تو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن دین کے انقلابی اور تحریکی پہلو پر زیادہ غور و خوض نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان گزشتہ ادوار میں اسلام عالمگیر سطح پر غالب و فائق رہا اور اس کے عالمگیر احیا کے لیے خود اس کا ایک انقلابی تحریک ہونا بطور مضمون کے کبھی موضوعِ تحقیق نہیں بن سکا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ جب آپ درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایم اے کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخل ہوئے تو برِّصغیر کے معروف مسلم فلسفی اور مفکّر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ جن کی زیرِ تربیت آپ کے انقلابی فکر کی آبیاری ہوئی چنانچہ آپ ان فکری امنگوں کے ساتھ بطورِ خاص امام غزالیؒ، مجددِ الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی افکار کی طرف متوجہ ہوئے دورِ جدید کے رہنماؤں میں سے جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ، حسن البنا، علامہ رشید رضا اور مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہم کے انقلابی رُجحانات اور تحریکات کا مطالعہ کیا۔ غیر مسلم مفکّرین اور داعیانِ انقلاب میں سے کارل مارکس، فریڈرک اینجلز، لینن، سٹالن اور ماؤزے تنگ وغیرہ کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا۔ ان غیر مسلم اشتراکی داعیانِ انقلاب کے افکار کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ان کی تحریروں میں اپنے افکار اور فلسفۂ انقلاب کی جو خود اعتمادی، عزم کی پختگی نظریاتی خاصیّت اور نتیجہ خیزی کا یقین پایا جاتا ہے عصرِ حاضر کے بیشتر اسلامی داعیانِ انقلاب کی تحریروں میں وہ بھی نظر نہیں آتا بلکہ اس تقابلی مشاہدے نے آپ کو مزید پریشان کیا کہ آج باطل کے مقابلے میں حق کے علمبردار اس قدر مایوسی، بے یقینی، نظریاتی التباس، فکری مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کا شکار ہو چکے ہیں کہ ان کی تمام تر مساعی کے نتائج اب صرف عقیدۂ آخرت میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور باطل سے دنیوی زندگی میں کامیاب ٹکر لینے کا تصوّر نا امیدی کی نذر ہو گیا ہے۔ اس فکری تناظر میں آپ نے ملّتِ مصطفوی کی عظمت و سطوت اور اسلام کی پارینہ شان و شوکت کو بحال کرانے کے لیے عالمی انقلاب کو اپنا مطمحِ نظر اور مقصدِ زیست بنا لیا۔

فکری ارتقاء و نشو و نما کے اس سفر میں مولانا احمد رضا خانؒ اور علامہ اقبال کے افکار و خیالات نے آپ کو اُمّتِ مُسلمہ کے دینی و ملّی تشخص اور اس کی بقا کے لیے نسبتِ مصطفویؐ کی پختگی کا درس دیا۔ آپ نے انقلابی زاویہ نگاہ سے قرآن و سنّت کا از سرِ نو عمیق مطالعہ کیا اور قرآن مجید کا ایک منتخب انقلابی نصاب تیار کیا۔ اس انداز میں مطالعۂ قرآن سے آپ کے عزائم و بصیرت اور خیالات کو قومی و ملّی سطح پر عالمگیر وسعت نصیب ہوئی جب کہ سنّت و سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے احیائے اسلام کی انقلابی جد و جہد کے لیے صحیح اور بے خطا خد و خال سامنے آئے۔

قرآنِ مجید نے بالآخر غلبۂ دینِ حق کی بحالی کی حتمی و قطعی ضمانت مہیا کر دی اور یوں آپ نے احیائے اسلام کے لیے عالمگیر اور ہمہ گیر جدّ و جہد کا عزم کر لیا۔

چنانچہ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۷۲ء بمطابق ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۹۲ھ بمقام دربارِ غوثیہ شارع الگیلانی کوئٹہ آپ نے زندگی کو وقفِ انقلاب کرنے کا حلف قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیّدنا طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی البغدادی مدظلہ العالی کے دستِ اقدس پر بصورتِ بیعت اٹھایا۔

یوں آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عملاً وقفِ انقلاب ہو گیا۔ اب یہی آپ کی زندگی کا مشن ہے اور یہی مقصدِ زیست۔

ذہنی وطبعی رُجحانات

پروفیسر محمد طاہر القادری راسخ العقیدہ حنفی المذہب ہونے کے باوجود جدید قانونی اقتصادی سیاسی اور بین الاقوامی مسائل میں قرآن و سنّت کی روشنی میں اجتہاد کے قائل ہیں۔ آپ شدّت سے محسوس کرتے ہیں کہ آئمہ متقدین و متاخرین کی فقہی آراء کی روشنی میں اجتہادی کاوشیں جاری رہنی چاہئیں اگر تمام معاملات میں محض تقلید ہی مکمل طور پر حاوی و طاری رہی تو مسلمانوں کی علمی صلاحیتیں زنگ آلود ہو کر ناکارہ ہو جائیں گی۔ ملّت کے احیاء اور اُمّت کے عروقِ مردہ میں تازہ زندگی پیدا کرنے کے لیے اسلافِ اُمّت اور آئمہ اسلام کی پیروی میں ان کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق اجتہادی اور تخلیقی انداز میں علمی ارتقاء کا سلسلہ قائم رہنا چاہیئے۔ پروفیسر محمد طاہر القادری کی قرآنی فکر اور فقہی و علمی سوچ کی نہج یہی ہے اور آپ اپنی تمام صلاحیتیں اسی مقصد کے حصول میں صَرف کر رہے ہیں۔ آپ اُمّتِ مسلمہ کے اتحاد کی سخت ضرورت محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گروہی، مسلکی یا فرقہ وارانہ نزاعات سے بلند ہوئے بغیر اسلام کے ہمہ گیر احیاء کا کام ممکن نہیں۔

آپ کا خیال ہے کہ مسلکی اور فقہی اختلافات عملاً ختم نہیں کئے جا سکتے لیکن انھیں وجہِ نزاع بنانا درست نہیں۔ مزید برآں ہر شخص کو اپنے اپنے عقیدہ و مسلک پر سختی سے قائم رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تاہم متفقہ اُمور میں اتحاد کر کے وسیع تر مقصد اور بلند تر نصب العین کے لیے کام کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ شخصی زندگی میں اصلاحِ احوال تزکیۂ نفس اور تطہیرِ باطن کے لیے اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے طریقِ کار کے بہت بڑے حامی اور مؤیّد ہیں۔ آپ کو اسلامی تصوّف و طریقت کی اُن حقیقی اور عملی تعلیمات سے بے پناہ شغف اور طبعی رغبت ہے جن کے بغیر انسان حُبِّ دُنیا، حبِ جاہ و منصب، حسد، بُغض و عناد، کبر و ریا، نفاق و منافرت آفاتِ نفس اور رذائلِ اخلاق سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ جس تصوّف و روحانیت کے قائل اور مبلّغ ہیں وہ عملی تصوّف ہے جو جمود و تعطّل سے بہت دُور سراسر حرکت و انقلاب ہے اور براہِ راست سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہے۔ جس کی تائید و تبلیغ ہمیشہ اکابر صوفیاء نے کی اور جس کے سبب سے اُمّت کے ادوارِ زوال میں بھی احیاءِ اسلام کی شمع فروزاں ہوتی رہی۔ آپ کے نزدیک آج بھی مذہبی اور اخلاقی و رُوحانی زندگی کے زوال و ابتلاء کا خاتمہ صرف اسی مثالی خانقاہی نظام کی بحالی سے ممکن ہے جس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابِ صُفہ کے گروہ کی صورت میں رکھی تھی۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک عُلماء و مبلّغین ہی واقعۃً "عشقِ الٰہی، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم" دردِ و سوز، دردں، صدق و

اخلاص، حسنِ نیت و عمل، للہیت، رضائے الٰہی، تقویٰ و طہارت، زہد و ورع اور نورِ عبادت و ریاضت جیسے فضائل پیدا نہیں ہو جاتے ان کی تبلیغ سے احوالِ زمانہ کا رُخ نہیں بدلا جا سکتا۔ آپ کے نزدیک انہی فضائل کی برکت سے انشراحِ صدر کی دولت نصیب ہوتی ہے اور سینہ و دل، معارفِ دین اور فیضانِ نبوّت کے قابل ہوتے ہیں۔ آپ قرآنی تعلیمات کی ایسی ترویج و اشاعت چاہتے ہیں جو عالمِ اسلام میں عظیم فکری اور عملی انقلاب کی بنیاد ثابت ہو جس سے انسانیت کو درپیش مسائل و مشکلات کا یقینی اور قابلِ عمل حل میسّر آئے۔ اسلام کی عالمگیر فتح اور غلبۂ دینِ حق کی بحالی کے لیے قرآن و سنت کے فکر پر مبنی عظیم عالمی انقلاب کو اپنا مقصدِ زندگی بنا لینے والا ہر شخص آپ کا رفیق ہے اور خود آپ کی زندگی کا ہر لمحہ اسی مقصدِ وحید کے لیے وقف ہے۔

پروفیسر صاحب کی تمام دینی خدمات وقف فی سبیل اللہ ہیں

پروفیسر صاحب کی نجی اور مشنری زندگی کا یہ پہلو قابلِ مطالعہ ہے کہ آپ کی تمام تر دینی و علمی خدمات جن میں آپ کی جملہ تصانیف، تقاریر، خطابات کے ریکارڈ شدہ کیسٹس، دروسِ قرآن اور جامع مسجد اتفاق کالونی لاہور کے خطباتِ جمعہ وغیرہ سب کچھ اللہ تعالےٰ کے دین اور حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کی خدمت کے لیے فی سبیل اللہ وقف ہیں۔ آپ ان میں سے کسی شے کا بھی کوئی معاوضہ، مشاہرہ، تنخواہ، کمیشن یا رائیلٹی وغیرہ نہیں لیتے —— ادارہ منہاج القرآن اور اتفاق اسلامک اکیڈمی کی سرپرستی بھی اسی طرح آپ کی فی سبیل اللہ خدمات ہی کا حصہ ہیں۔

مزید برآں آپ کے اندرونِ ملک کراچی سے پشاور تک تمام تبلیغی اور تنظیمی دورے، مختلف مقامات پر دروسِ قرآن کے مراکز اور ادارہ منہاج القرآن کی تنظیمی شاخوں کے قیام کے سلسلہ میں جس قدر بھی مساعی ہیں وہ سب کی سب بلا معاوضہ و مشاہرہ صرف اور صرف رضائے الٰہی کے لیے وقف ہیں۔ اسی طرح آپ کے بیرونِ ملک عالمِ اسلام اور یورپ تک کے وقتاً فوقتاً ہونے والے تبلیغی دورے بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ آپ نے آج تک مذکورہ بالا جملہ دینی، علمی، تحقیقی، تقریری، تحریری اور تنظیمی سرگرمیوں پر ایک پائی تک کا معاوضہ بھی کسی جماعت، طبقے، تنظیم، خاندان یا فرد سے وصول نہیں کیا بلکہ آپ نے خدمتِ دین کے ضمن میں معاوضوں اور مشاہروں کو اپنے اوپر کلیتہً حرام کر لیا ہوا ہے۔

یہ پہلو اس لیے حق کے متلاشیوں کے لیے بڑا حوصلہ افزا اور ایمان افروز ہے کہ آج کے دور میں بھی اگر کوئی شخص اپنا تن من دھن سب کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف کرتے ہوئے ہر قسم کے دنیوی مفاد و منفعت اور حرص و لالچ سے بالاتر ہو کر اخلاص کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ کی مدد و نصرت اس کے مشن میں اس طرح شاملِ حال رہتی ہے کہ اس کے راستے کی سب رکاوٹیں ازخود دُور ہوتی چلی جاتی ہیں اور خلقِ خدا بہ دل و جاں اُس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔

اسی طرح آپ نے ادارہ منہاج القرآن اور کاروانِ اسلام کے نام پر دینی احیاء کی جس عالمگیر تحریک

کا آغاز کیا ہے وہ بھی کسی مخصوص فرد، جماعت یا تنظیم کی مالی معاونت کی نہ محتاج ہے نہ ہوگی۔ ادارہ منہاج القرآن اور کاروانِ اسلام کے جملہ مالی وسائل کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ پروفیسر صاحب کی تصانیف کی جملہ آمدنی اسی مشن کے لیے وقف ہے۔ جس میں سے وہ خود ایک پائی بھی وصول نہیں کرتے۔

۲۔ پروفیسر صاحب کی تقاریر و خطابات کے ریکارڈ شدہ کیسٹس کی جملہ آمدنی بھی مشن ہی کے لیے وقف ہے اور اس میں سے بھی وہ ایک پائی تک وصول نہیں کرتے۔

نوٹ: (واضح رہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے پروفیسر صاحب کی تصانیف اور خطبات کی ریکارڈ شدہ کیسٹوں کی سالانہ سیل لاکھوں روپے کے حساب تک متجاوز ہے جس میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے)

۳۔ ادارے کے رفقاء کا ماہانہ چندہ۔

۴۔ ادارے کے رفقاء اور وابستگان کے خصوصی عطیات جس سے ادارے کی تعمیرات کے اخراجات کی کفالت ہو رہی ہے۔ واضح رہے کہ تعمیرات کا یہ منصوبہ بھی محض رفقاء ادارہ کے اجتماعی تعاون کا نتیجہ ہے۔

یہاں یہ پہلو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پروفیسر صاحب نے اپنی زندگی کو اسی دن سے ہی کلیتہً دنیوی منفعت و معاوضہ کے تصور سے بالاتر ہو کر محض رضائے الٰہی کے لیے وقف کر دیا تھا جس دن سے آپ نے احیائے اسلام کے عالمگیر انقلاب کے لیے حلف کی صورت میں خود کو بارگہِ ایزدی اور بارگہِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا۔

۱۹۷۴ء میں جب آپ کے والدِ گرامی حضرت علامہ ڈاکٹر فریدالدین قادریؒ کا وصال ہو گیا تو اس کے بعد جھنگ کے زمانۂ قیام میں گھریلو ذمہ داریوں کی کفالت کا سارا بوجھ آپ کے کندھوں پر آن پڑا۔ بحمداللہ تعالےٰ آپ نے لاہور منتقل ہونے سے پہلے کم و بیش اس چار سالہ دور کو محض اللہ کے فضل و احسان سے کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ اسی دور سے آپ نے مشنری جدوجہد کا بھی آغاز کر دیا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسی دَور کے ابتدائی زمانہ میں آپ گورنمنٹ کالج میں بطور لیکچرار تعینات تھے اور بعد ازاں جھنگ ڈسٹرکٹ کورٹس میں بطور ایڈووکیٹ پریکٹس کرتے رہے۔ اس دَور میں طرح طرح کی مالی اور دیگر مشکلات و آلام کی کثرت نے آپ کو بارہا گھیرا لیکن راقم الحروف خود شاہد ہے کہ اللہ کے فضل سے آپ نے یہ زمانہ بھی اللہ کی مدد و نصرت سے پورے صبر و توکل اور استغناء کے ساتھ گزارا۔

بعد ازاں ۱۹۷۸ء میں لاہور منتقل ہوتے ہی آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں ملازمت اختیار کر لی جسے آپ نے ۱۹۸۲ء تک مستقل بنیادوں پر قائم رکھا۔ آپ کے قریبی دوست اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ قیامِ لاہور کا ابتدائی چار سالہ دور بھی آپ نے جس صبر و توکل کے ساتھ بسر کیا ہے اس کی رُوداد سُن کر بھی عام انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے شب و روز کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان احوال سے پورے

طور پر تو اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے یا ان کے اپنے گھر کے شب و روز۔ لیکن باوجود تمام تر صلاحیتوں اور دنیوی مواقع کی فراوانی کے، آپ نے ناجائز اور غیر اخلاقی طور پر مالی وسائل پیدا کرنا تو درکنار محض اہلِ علم کے ہاں متداول طریق کے مطابق اپنی دینی خدمات کو بھی اپنا ذریعہ معاش بنانا گوارا نہ کیا اور جب ادارہ منہاج القرآن کے قیام کے بعد آپ کی دینی، تحقیقی، تصنیفی اور تبلیغی مصروفیات میں اس حد تک اضافہ ہو گیا کہ پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت کو بھی مستقل بنیادوں پر قائم رکھنا عملاً ممکن نہ رہا تو آپ اس سے بھی مستعفی ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کے لیے ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا مستقل انتظام کرنے کی خاطر آپ نے اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد میں سے جو کچھ ممکن تھا فروخت کر دیا یہاں تک کہ آپ کے پاس اپنے آبائی وطن جھنگ صدر میں اپنے عارضی قیام کے لیے بھی اب ایک کمرہ تک باقی نہیں رہا اور آپ وہاں کی ساری جائیداد فروخت کرکے اسے لاہور میں آزادانہ بنیادوں پر رزقِ حلال کی فراہمی پر صرف کر چکے ہیں باوجودیکہ تمام اعزہ و اقارب اور احباب کے منع کرنے کے کہ کم از کم اس مکان کو نہ بیچا جائے جس سے آپ کے بچپن اور جوانی کی پوری تاریخ وابستہ ہے جس سے والدین کی شفقت و محبت اور لطف و مروّت کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ آپ نہ مانے اور کہا یہ زندگی کی جذباتی یادیں اپنی جگہ درست سہی لیکن مجھے لاہور میں اپنے قیام اور ماہانہ گھریلو ضروریات کی کفالت کے لیے بھی کوئی مستقل انتظام کرنا ہے۔

چنانچہ آپ نے اس جائیداد کے علاوہ گھریلو زندگی کی بھی کئی اشیاء اس مقصد کے لیے فروخت کر دیں اور یوں مختلف ذاتی ذرائع سے کچھ سرمایہ فراہم کیا۔ بعض قریبی دوستوں سے ادائیگی کے وعدے پر کچھ قرضہ جات بھی لیے۔ بالآخر اس طرح انھوں نے لاہور میں اپنی رہائش کے لیے مکان خریدا اور گھریلو ضروریات کی کفالت کے لیے کئی دوست کے ساتھ شراکت کی بنا پر ایک چھوٹا سا کاروبار تشکیل دیا۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے "VISITING - PROFESSOR" کے طور پر ایل۔ایل۔ایم کی کلاسز کی تدریس کی حد تک اپنا تعلق بھی قائم رکھا ہوا ہے۔ جس سے کچھ اعزازیہ بھی ملتا ہے۔ اسی طرح سپریم کورٹ، شریعت بنچ، وفاقی شرعی عدالت اور دیگر قومی سطح کے سرکاری اداروں سے بطور مشیر کے جو تھوڑا بہت اعزازیہ ملتا ہے ان تمام ذاتی وسائل سے آپ اپنی ضروریاتِ زندگی کی کفالت بھی کرتے ہیں اور ماہانہ اقساط کی صورت میں قرضہ جات کی ادائیگی بھی۔ مگر جہاں تک آپ کی دینی اور تبلیغی خدمات کا تعلق ہے اس کو آپ نے کسی لحاظ سے بھی اپنا ذریعۂ روزگار نہیں بنایا اور نہ ہی اس ضمن میں آپ نے کسی کے زیرِ بارِ احسان ہونا گوارا کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی لاکھوں روپے کی مالیتی لائبریری (جو آپ نے اپنے والدِ ماجد سے وراثتاً پائی تھی) بھی اپنی دیگر تصنیف کردہ کتب اور کیسٹس کے ساتھ ادارہ منہاج القرآن کو وقف کر دی ہے اور یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ میرے بعد میرے خاندان، میری اولاد یا ورثاء میں سے کوئی شخص بھی میری جملہ دینی خدمات سے حاصل ہونے والے سرمائے یا مالی مفاد پر کوئی استحقاق نہ رکھ سکے۔ کیونکہ یہ سب کچھ وقف فی سبیل اللہ ہے۔

پروفیسر صاحب کی زندگی کے اس ذاتی گوشے کی تفصیل سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اس لیے بیان کر دی گئی

ہے کہ کسی کو حالات سے ناواقفیت کے باعث کوئی غلط فہمی نہ ہو بلکہ دین کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے آج بھی ایک عملی مثال سامنے آ سکے تاکہ وہ اس سے سامانِ عزم و ہمت حاصل کریں۔ مزید یہ کہ دعوتِ حق کی ذمہ داری ادا کرنے والوں کی زندگی کا ہر پہلو بہر طور لوگوں کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند رہنا چاہیئے تاکہ لوگوں کو اس کی خلوت و جلوت، اندرونی و بیرونی اور نجی و سماجی زندگی کے سارے معاملات کا صحیح علم ہو۔ یہی معیارِ قیادت اُمت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور عمل کی صورت میں عطا فرمایا ہے۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ

تصانیف

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی مندرجہ ذیل تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

۱۔ تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)
۲۔ سورۃ فاتحہ اور تعمیرِ شخصیت
۳۔ اسلامی فلسفۂ زندگی
۴۔ اجزائے ایمان (حصہ اول)
۵۔ اجزائے ایمان (حصہ دوم)
۶۔ اجزائے ایمان (مکمل) مجلد
۷۔ ایمان اور اسلام
۸۔ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
۹۔ مناہج العرفان فی لفظِ القرآن
۱۰۔ بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ)
۱۱۔ منافقت اور اس کی علامات
۱۲۔ سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۱۳۔ معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۱۴۔ اجتہاد اور اس کا دائرہ کار

۱۵۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفۂ خودی
۱۶۔ تاریخ فقہ میں ہدایہ و صاحبِ ہدایہ کا مقام
۱۷۔ معارفِ اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۱۸۔ شہادتِ توحید
۱۹۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مصلحِ سیاست
۲۰۔ اقبال اور تصورِ عشق
۲۱۔ تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
۲۲۔ حکمتِ استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم)
۲۳۔ فلسفۂ تسمیہ (تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)
۲۴۔ معارفِ اسم اللہ جل جلالہ
۲۵۔ صفتِ رحمت کا شانِ امتیاز
۲۶۔ عصرِ حاضر اور فلسفۂ اجتہاد
۲۷۔ حصولِ مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
۲۸۔ پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
۲۹۔ قرآنی فلسفۂ تبلیغ
۳۰۔ فطرت کا قرآنی تصور
۳۱۔ قرآنی فلسفۂ عروج وزوال
۳۲۔ پیغمبرِ انقلاب اور صحیفۂ انقلاب
۳۳۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (وقت کی اہم ضرورت)
۳۴۔ علم۔ توجیہی یا تخلیقی
۳۵۔ دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو

۳۶۔ مغربی اور اسلامی تصورِ قانون کا تقابلی جائزہ
۳۷۔ نص اور تعبیرِ نص
۳۸۔ قرآن اور شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

۳۹۔ Islam In Various Perspectives
۴۰۔ Quranic Concept of Human Guidance
۴۱۔ Islam and Freedom of Human will
۴۲۔ Islamic Concept of Human Nature
۴۳۔ Quranic Basis of Constitutional Theory
۴۴۔ Philosophy of Ijtihad and the Modern World
۴۵۔ Islamic Concept of Crime ۴۶۔ Islam-The State Religion
۴۷۔ Islamic Philosophy of Punishments
۴۸۔ Islamic Concept of Law ۴۹۔ What Islam is ?
۵۰۔ Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
۵۱۔ Islamic Philosophy of Human Life
۵۲۔ Islam and Christianity
۵۳۔ Islam and Modern Medicine
۵۴۔ Quranic Concept of Benevolence
۵۵۔ Finality of the Prophethood

زیرِ طبع و زیرِ ترتیب تصانیف

۵۶۔ عورت کی دیت کا مسئلہ
۵۷۔ التصوف فی الاسلام
۵۸۔ اسلام کا تصورِ ملکیت
۵۹۔ الاربعین فی فضائل النبی الامین
۶۰۔ فلسفۂ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۶۱۔ علم، قانون اور اجتہاد
۶۲۔ تعلیمی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

۶۳۔ حقیقتِ صلوٰۃ

۶۴۔ حقیقتِ صوم

۶۵۔ حقیقتِ حج

۶۶۔ حقیقتِ زکوٰۃ

۶۷۔ قرآنی فلسفۂ انقلاب

۶۸۔ اسلام اور سائنس

۶۹۔ اسلام اور طبِ جدید

نوٹ : پروفیسر صاحب کی شہرۂ آفاق تفسیر منہاج القرآن کی پہلی جلد بہت جلد منظرِ عام پر آرہی ہے۔ سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تصوف پر دروس اور خطبات کا ضخیم مجموعہ بھی تیار ہو چکا ہے جن کی ترتیب وتدوین کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کے مختلف علمی وعملی اور روحانی وانقلابی پہلوؤں پر پروفیسر صاحب کے سینکڑوں مسودات ترتیب وتدوین کے مراحل میں ہیں جن پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جسدِ ملت میں فرقہ پرستی اور تفرقہ پروری کا زہر اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ نہ صرف اس کے خطرناک مضمرات کا کما حقہٗ احساس و ادراک ہر شخص کے لیے ضروری ہے بلکہ اس کے تدارک اور ازالے کے لیے مؤثر منصوبہ بندی کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے گرد و پیش تیزی سے جو حالات رونما ہو رہے ہیں ان کی نزاکت اور سنگینی اس امر کی متقاضی ہے کہ ہم نوشتۂ دیوار پڑھیں اور اپنے درمیان سے نفرت، بغض، نفاق، تشتّت اور انتشار و افتراق کا قلع قمع کر کے باہمی محبّت و مودّت، اخوّت و یگانگت، یک جہتی اور اتحاد بین المسلمین کو فروغ دینے کی ہر ممکن سعی کریں کہ اسی میں ہماری بقاء اور فلاح و نجات مضمر ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں اہلِ اسلام میں فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے رُجحانات کا تفصیلاً جائزہ لیا گیا ہے۔ اور قرآن و سنّت کی روشنی میں اس کے انسداد کیلئے ایک قابلِ عمل حل WORKABLE SOLUTION اُمّتِ مسلمہ کے سامنے رکھا گیا ہے۔ آج کی معروضی صورتِ حال میں یہ مضمون اپنی اہمیّت کے اعتبار سے بجا طور پر اس بات کا مستحق ہے کہ تمام مسالک اور مکاتبِ فکر کے دردِ دل رکھنے والے حضرات اس کے مندرجات کا سنجیدگی اور غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کریں اور قرآن و سنت کی روشنی میں فرقہ پرستی کے منفی رُجحانات کے خلاف

منظم تحریک بلکہ جہاد کا آغاز کریں۔

اسلامی معاشرے کے قیام کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۔[1]

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو اور سب مل کر مضبوطی سے اللہ کی رسّی کو پکڑو اور جدا جدا نہ ہونا۔ یاد رکھو اللہ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی۔ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پس اس نے تمہارے دلوں میں باہمی اُلفت و محبت پیدا کر دی اور تم اللہ کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔

ان آیاتِ کریمہ میں باری تعالےٰ تمام مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ تقویٰ اختیار کریں یعنی اللہ تعالےٰ سے اس طرح ڈریں جس طرح ڈرنے کا حق ہے۔ یہ عمومی حکم تمام اہلِ اسلام کے لیے ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی پل خوف اور خشیتِ خداوندی سے خالی نہ ہو اور جب زندگی کا سفر تمام ہو اور موت کی ساعت آپہنچے تو وہ بھی حالتِ اسلام میں ہی آئے۔ اس کے بعد ان کو اللہ کی رسّی یعنی دینِ محکم کو مضبوطی سے تھام کر باہمی اتحاد و اتفاق کی تلقین اور تفرقہ و انتشار

[1] آلِ عمران ۳ : ۱۰۲ - ۱۰۳

سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ آخر میں اس احسان کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح اللہ نے انھیں آگ کے گڑھے کے کنارے یعنی یقینی تباہی سے بچایا۔ اور نفرت و کدورت کی جگہ ان کے دل میں باہمی محبت و مودّت ڈال دی۔

ان ارشاداتِ ربّانی کی رُو سے مسلمانوں پر ایک فعّال اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے دو قسم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔

انفرادی ذمہ داری

اسلامی معاشرے کی کامیابی کی شرطِ اوّلین یہ بیان کی گئی ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہر فرد اپنی اپنی جگہ اپنی ذمہ داری مقدور بھر ادا کرے۔ اس بارے میں ارشادِ ربّانی ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔[1]

اللہ تعالےٰ کسی کو اس کی استطاعت اور توفیق سے بڑھ کر تکلیف میں نہیں ڈالتا۔

اس آیت میں جہاں انسانوں پر استطاعت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہ ڈالنے کا ذکر ہے وہاں یہ بھی بالواسطہ مذکور ہے کہ ہر کسی کو اپنی اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق انفرادی طور پر اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔ ورنہ اُس کا خدا کے ہاں مواخذہ ہوگا۔

مسلم معاشرے کے تمام افراد کا اپنے اندر انفرادی ذمہ داری کے احساس کا اُجاگر کر لینا کامیابی و کامرانی کی خشتِ اوّل ہے کیونکہ اصلاحِ احوال کی جانب پہلا قدم ہی تقویٰ کو پوری زندگی میں جاری و ساری کرنا قرار دیا گیا ہے تقویٰ کیا ہے؟ امام راغب اصفہانی المفردات میں فرماتے ہیں:

التقوىٰ حفظ الشئ مما يؤذيه و يضره [2]

تقویٰ سے مراد ہر اس چیز سے محفوظ رہنا ہے جو تکلیف اور نقصان پہنچائے

[1] البقرہ ۲ : ۲۸۶

[2] المفردات : ۵۶۸

تقویٰ کی تعریف ایک مقام پر ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے۔

التقویٰ حفظ النفس عما یؤثم ۵ (تقویٰ سے مراد ہر اس شے سے بچنا ہے جو گناہ میں مبتلا کردے۔)

آیتِ مذکورہ میں "وَلَا تموتنّ الّا وانتم مسلمون" کہہ کر انتہائی اہم نکتہ سمجھا دیا گیا ہے کہ جینا اور مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہو۔ زندگی بھی اسلام کی نذر ہو اور موت بھی اسی کی۔ گویا انفرادی ذمہ داری کا معنی یہ ہے کہ بجائے دوسروں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کے ہر انسان اصلاحِ احوال کا آغاز خود اپنی ذات سے کرے۔ وہ جہاں کہیں بھی جس حیثیت سے ہے سب سے پہلے اپنی اخلاقی ذمہ داری نبھائے۔ دوسروں سے اصلاح کی توقع کر کے نہ بیٹھا رہے۔ اس وقت ہماری خرابی یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی ذمہ داری عملاً نبھانے کی بجائے دوسروں کو موردِ تنقید بناتے رہتے ہیں اور اس طرح کہیں سے بھی اصلاح کا آغاز نہیں ہو پاتا۔

اجتماعی ذمہ داری

اسلامی معاشرے کو صحیح خطوط پر منظم کرنے کی ذمہ داری من حیث المجموع تمام اُمتِ مسلمہ پر ہی ڈالی گئی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ زمانی و مکانی حدود سے ماوراء قیامت تک تمام نسلِ انسانی کے لیے ہے۔ اس لیے اجتماعیت کا تصور اسلام کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔ اجتماعیت جسدِ اسلام کے رگ و ریشہ میں اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہر جگہ اس کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ شجرِ اسلام کے برگ و بار کو زمانے کی بلاخیزیوں سے محفوظ کرنے کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

۵ المفردات : ۵۶۸

کی سیرتِ طیبہ ہی مشعلِ راہ ہیں۔ اس لیے فرقہ پرستی کے بلاخیز طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی جس ضابطۂ عمل کو اپنانے کی ضرورت ہے وہ قرآن و سُنّت کے تصورِ اجتماعیت پر مبنی ہونا چاہیے۔

فلسفۂ اعتصام اور تصورِ وحدت

ارشادِ ربانی ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۱ "اور تم سب مل کر مضبوطی سے اللہ کی رسّی کو پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہونا"

محولہ بالا آیت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کا پہلا حصہ امر اور دوسرا نہی پر مبنی ہے۔ اس کے ذریعے بیک وقت مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے واضح احکام صادر فرمائے گئے ہیں۔ قرآن و سنّت کے بیشتر احکام امر کی نوعیت کے ہوتے ہیں یا نہی کی نوعیت کے۔ جنہیں آج کی جدید قانونی اصطلاحات میں بالترتیب "ACTS OF COMMISSION" اور "ACTS OF OMMISSION" کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا آیہ کریمہ قرآن کے ان مقامات میں سے ہے جہاں مثبت اور منفی دونوں احکام کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ اہلِ ایمان سے خطاب فرما رہے ہیں کہ "تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو" یہ تو تھا مثبت حکم۔ اس کے بعد امتناعی حکم آتا ہے اور "خبردار تم باہمی تفرقہ اور انتشار کا شکار نہ ہونا" اس میں واضح اور غیر مبہم طور پر فرقہ پرستی اور تفرقہ پروری کی مذمت کی گئی ہے۔ گویا یہ آیت اخوّت و اتحاد کی دعوت اور تفرقہ و انتشار کی مذمت، دونوں پہلوؤں کو اپنے دامن میں لیے ہوتے ہے۔ یہاں بڑی وضاحت سے اُمتِ واحدہ کے تصوّر کو اذہان و قلوب میں جاگزیں کیا گیا ہے کہ ظہورِ اسلام

۱ آلِ عمران ۳ : ۱۰۳

کا بنیادی مقصد نسل و رنگ اور شعوب و قبائل پر مبنی عصبیت و تفاخر کے بتوں کو توڑ کر تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لانا اور ایک دائمی وحدت کے رشتے میں منسلک کرنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیات طیبہ بھی اسی مقصد کی غماز اور آئینہ دار ہے جو قرآنِ حکیم کا منشاء نزول ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگراند

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسھر والحمی[1]

مسلمانوں کی باہمی محبت اور رحمت و مودت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہی جسم ہو جس میں ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم بے خواب و بے آرام ہو جاتا ہے۔

جس طرح ایک جسم کے مختلف اعضاء اپنی جداگانہ حیثیت اور انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے درپے آزار نہیں ہوتے بلکہ پورے جسم کے لیے تقویت کا باعث بنتے ہیں۔ بعینہٖ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق تمام اُمتِ مسلمہ بمنزلہ ایک جسم کے ہے اور اس کے افراد بمنزلہ اعضاء۔ جسم کا ایک عضو بھی تکلیف اور درد میں مبتلا ہو تو بقیہ سارے اعضاء چین اور آرام سے نہیں رہ سکتے۔ درد بے شک جسم کے کسی ایک حصے میں ہو اس کے لیے آنکھ اشکبار ہوتی ہے۔ یہی رشتہ ایک مسلمان فرد کا ملتِ اسلامیہ سے ہونا چاہیے۔ جو آنکھ کا کا پورے جسم سے ہوتا ہے۔

[1] الصحیح المسلم ۲۰ : ۳۲۱

بقول شخصے

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دیکھا جائے تو یہی اجتماعی درد کا وہ لازوال رشتہ ہے جو ملتِ اسلامیہ کے افراد کی کثرت کو ایک وحدت میں بدل دیتا ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جیسے جسم کا کوئی ایک حصہ دوسرے سے برسرِ پیکار نہیں ہو سکتا، بلکہ تمام اعضائے جسم کو بیرونی خطرات سے بچانے کے لیے ہمہ وقت متحد اور مستعد رہتے ہیں۔ بلکہ ہر ایک کی حفاظت کی ضمانت دوسرے عضو کی حفاظت میں مضمر ہوتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کے مختلف فرقے اور طبقے جو جسم ملت کے مختلف اعضاء ہیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو کر نہ صرف ملت کی اجتماعی سلامتی اور تحفظ کو معرضِ خطر میں ڈال رہے ہیں بلکہ اپنے انفرادی تحفظات کو بھی تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ مختلف طبقوں اور فرقوں کی مثال ندی نالوں کی سی ہے۔ جو ایک ہی دریا سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ دریا کی روانی سے ہی ان کا بہاؤ جاری ہے۔ اگر دریا ہی خشک ہو گیا تو ان کا اپنا وجود کب برقرار رہے گا۔

تفرقہ پروری کی موت کفر کی موت ہے۔

اجتماعیت کو چھوڑ کر جدا جدا اکائیوں میں منقسم ہو جانا اور اپنے اپنے تشخصات میں گم ہو جانا تشتت اور انتشار کو جنم دیتا ہے جس سے ملت کی اجتماعی قوت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ بالآخر فرقہ بندی اور تفرقہ پروری کی یہی زندگی ایسی موت

کی طرف لے جاتی ہے جو قرآن کی اصطلاح میں کفر کی موت ہے۔ اسی فلسفے کی وضاحت حضور علیہ السلام نے یوں فرمائی ہے:-

ید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ الی النار ۔ ؎

اجتماعی وحدت کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوتی ہے جو کوئی اس سے جدا ہو گا دوزخ میں جا گرے گا۔

فرقہ بندی زیاں کاری ہے

آج شومیٔ قسمت سے حالت یہ ہو گئی ہے کہ ملتِ اسلامیہ مختلف طبقوں اور فرقوں میں منقسم ہو کر اپنے اپنے مسلک کے تحفظ کو اسلام کی سلامتی اور استحکام کا ضامن گردان رہی ہے۔ ہر مسلک کے پیرو اس حقیقت سے کلی طور پر اغماض برت رہے ہیں کہ اگر خدانخواستہ دشمن کے ہاتھ اسلام کے دامن تک پہنچ گئے اور خاکم بدہن محمد عربی ؐ کی ملت کو اجتماعی طور پر کوئی گزند پہنچ گیا تو تمہارے مسلکوں اور فرقوں کو کون سلامتی کی ضمانت دے گا؟ قرآن حکیم کا فلسفۂ اعتصام ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس امر کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ باہمی انتشار و تفرقہ سے احتراز کر کے ازسرِ نو اپنی شیرازہ بندی کی تدبیر کریں۔ کہ یہی عافیت اور سلامتی کا راستہ ہے۔ قرآن نے باہمی جدل و پیکار کو یہودیت کا تصورِ حیات قرار دیا ہے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جن اسباب کی بنا پر یہودیوں پر ادبار و انحطاط اور عالمگیر تباہی کے سائے مسلط کر دیئے گئے تھے۔ اگر وہی اسباب امتِ مسلمہ میں مجتمع ہو گئے تو پھر یہ بات یقینی سمجھ لیجئے کہ ویسی ہی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر تباہی تمہارا مقدر بن سکتی ہے۔ یہ کوئی زبانی نظریہ نہیں بلکہ قرآنی اعلان اور تاریخی مشاہدے کی بات ہے کہ باہمی اختلاف و نزاع اور تفرقہ پروری کے نتیجے ـــــ

؎ ترمذی، ۲ : ۳۹

میں قوموں کا وقار مجروح اور رعب و دبدبہ ختم ہو جاتا ہے اور دشمنوں کی نظر میں ان کی حیثیت بالکل گر جاتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

فَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ۔ ؎

پس اختلاف میں نہ پڑو اس طرح تم بزدل بن جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (دبدبہ ختم ہو جائیگا)

اس قرآنی اعلان کی تائید ہمیں زوالِ خلافتِ بغداد کی تاریخ سے مکمل طور پر میسر آتی ہے۔

زوالِ خلافتِ بغداد ـ ایک تاریخی جائزہ

فرقہ پرستی کی تنگنائوں میں بھٹکنے والے ناعاقبت اندیش مسلمان کے لیے زوالِ بغداد کی تاریخ عبرتناک منظر پیش کر رہی ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

۶۵۶ ھ کا دور تھا۔ خلافت عباسیہ اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی خلیفۂ وقت مستعصم باللہ کا وزیرِ اعظم ابن علقمی شیعہ مسلک رکھتا تھا۔ فرقہ پرستی کا بازار گرم تھا اور مسلکوں کی باہمی کشمکش اور آویزش اپنے عروج پر تھی۔ بغداد کے گلی کوچے مناظروں اور بحث و تکرار کا مرکز بن چکے تھے۔ وزیرِ اعظم کی سیاست شیعہ مسلک کے گرد گھومتی تھی۔ جب کہ خلیفہ کا بیٹا ابوبکر سُنّی عقائد کا نقیب تھا۔ دونوں فرقے باہم دست و گریباں تھے اور سارا بغداد تفرقے کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس اندرونی خلفشار سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہوتی گئی اور نوبت

؎ الانفال ۸ : ۴۶

یہاں تک آپہنچی کہ منگولوں اور تاتاریوں کا فتنہ اسلامی خلافت کی سرحدوں پر منڈلانے لگا۔ ہلاکو کے طوفانی دستے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھے اور دیکھتے دیکھتے بغداد کی عظیم سلطنت کو خس وخاشاک کی طرح بہا کرلے گئے۔ تاتاریوں نے عظیم الشان اسلامی تہذیب و تمدن کی روشن شمعوں کو آنِ واحد میں گل کر دیا۔ ظلم و بربریت کے وہ پہاڑ توڑے کہ ایک اندازے کے مطابق بیس بائیس لاکھ افراد تہہ تیغ کر دیئے گئے اور دریائے دجلہ کا پانی تین دن تک اُن کے خون سے سرخ رہا۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق تاتاریوں کو بغداد پر حملے کی دعوت بھی کچھ ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے ہی اپنے فرقہ وارانہ تعصب کی آگ بجھانے کی خاطر دی تھی ورنہ خلافتِ بغداد کا دبدبہ باوجود سیاسی کمزوری کے چار دانگِ عالم پر چھایا ہوا تھا اور کسی کو اسلام کے اس مرکز پر حملہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس رستاخیز بربریت کے عالم میں شیعہ اور سُنی دونوں یکساں طور پر تاتاریوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے اور ان کی عبادت گاہیں، مسجدیں، محراب و منبر اور علمی مراکز تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ تاریخ کی زبان صرف زوالِ بغداد کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ دوسرے حوالوں سے بھی ہمکلام ہورہی ہے کہ جب بھی دشمن کو اہلِ اسلام پر غلبہ حاصل ہوا اس کا ہدف کوئی خاص مسلک نہ تھا بلکہ بلا امتیاز سب مسلمان تھے۔ افغانستان میں روس کی فوج کشی ہو یا فلسطین و لبنان میں جنگباز اسرائیل کی خون آشامی دونوں کا نشانہ مسلمان ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی فرقہ یا مسلک سے تعلق رکھتے ہوں۔ اگر خدانخواستہ سرزمین پاک پر دشمن کے قدم پہنچ گئے اور وہ اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہوگیا تو ہمارا بھی حشر دوسروں سے مختلف نہ ہوگا۔ پھر جو تباہی ہوگی اس میں نہ کوئی بریلوی بچ سکے گا نہ دیوبندی، نہ کوئی اہلحدیث اور نہ کوئی شیعہ۔

اُمّتِ مصطفوی کے لیے مؤثر بنائے اتحاد کیا ہے؟

مسلمان اپنے تشخصات کے باوصف اگر ایک مرکز پر باہم متحد ہونا چاہیں تو ان کے اشتراک کی بنیاد صرف اور صرف حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط غلامی و محبت، مخلصانہ اطاعت و وفاداری اور آپ کی سنت و سیرت کی مکمل پیروی اور اتباع ہے۔ محض عقیدۂ توحید کی بنیاد پر مسلمانوں کا اتحاد ممکن نہیں کیونکہ خدا کے پرستار تو یہودی اور دیگر الہامی مذاہب کے پیروکار بھی ہیں۔ عقیدۂ توحید کے دعویدار وہ بھی ہیں مگر وہ نسبت جو ہمیں اور اُن کو دو الگ اُمتوں میں تقسیم کر رہی ہے۔ صرف نسبتِ نبوی ہے اور یہی حقیقی توحید کا عملی تشخص ہے۔ ہم صرف اُمتِ مصطفویؐ کے حوالے سے عیسائیوں اور یہودیوں سے ممیز ہیں۔ صرف یہی وہ بنائے محکم ہے جس پر شرق و غرب کے مسلمانوں کو باہم متحد اور منظم کیا جاسکتا ہے کیونکہ باری تعالےٰ نے فرشتوں کی زبان سے یہ اعلان کروایا ہے:

من اطاع محمداً فقد اطاع الله ومن عصى محمداً فقد عصى الله و محمد فرق بين الناس [1]

جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور محمدؐ لوگوں (کافر و مومن) کے درمیان وجہ امتیاز ہیں۔

---

[1] الصحیح البخاری ۲ : ۱۰۸۱

تفرقہ بازوں کے ساتھ انقطاعِ تعلق کا حکم:

ایک مقام پر آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ [1]

بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی گروہ ہو گئے (اے محبوب) آپ کا اُن سے کوئی علاقہ (تعلق) نہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے کوئی سروکار اور تعلق نہ رکھیں جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی جمعیت کا شیرازہ منتشر کر ڈالا۔ اس سے بڑھ کر فرقہ پرستی کی مذمت اور کیا ہو گی۔ فریقین کے درمیان تعلق کا ٹوٹنا کبھی ایک فریق کی جانب سے ہوتا ہے اور کبھی دوسری جانب سے۔ اساطیرِ قرآنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ پہلی اُمتوں کے لوگوں نے اپنی بد اعمالیوں کی بنا پر خود اپنے نبی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور وہ فسق و فجور اور کفر و طغیان کے اندھیروں میں بھٹک گئے۔

لیکن یہ بدبختی کی انتہا ہے کہ اُمت کے لوگ اخلاقی بے راہروی میں اس حد تک ملوث ہو جائیں اور دین کی اصل تعلیم سے اس طرح ہٹ جائیں کہ ان کا نبی حکمِ خداوندی سے خود اُن اُمتیوں سے قطع تعلق کر لے۔ یہ اتنی بڑی حرماں نصیبی ہے کہ جس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ذرا غور کیجئے فرقہ پرستی کو قرآن نے کیسی بدبختی سے تعبیر کیا ہے۔ دینی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور باہمی نفرت و انتشار کو ہوا دینا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی پاداش میں نبی خود ایسے اُمتیوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ گویا اُمت کا تعلق

[1] الانعام ٦ : ١٥٩

اپنے نبی کے دامن سے اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب تک اُمتی اپنے آپ کو ایک وحدت کی لڑی میں منسلک رکھیں۔

تفرقہ پروری نگاہِ نبوت میں

ملّی شیرازے کو تفرقہ و انتشار کے ذریعے تباہ کرنے والوں کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی سخت احکامات صادر فرمائے ہیں۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَتَاکُمْ وَاَمْرُکُمْ جَمِیْعٌ یُرِیْدُ اَنْ یُفَرِّقَ جَمَاعَتَکُمْ فَاقْتُلُوْهُ [1]

جو شخص بھی تمہاری جماعت کی وحدت اور شیرازہ بندی کو منتشر کرنے کے لیے قدم اٹھائے اُس کا سر قلم کر دو۔

ملّی شیرازہ بندی کو نقصان پہنچانے والوں کا جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سر قلم کر دیئے جانے کا حکم دیا ہے وہیں اُن کی پہچان اور اندازِ فکر و عمل بھی شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے تاکہ ہر دور میں فتنہ پرور اور انتشار پسند عناصر کی پہچان ہوتی رہے۔

عن حذیفة بن الیمانؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مما اخاف علیکم رجل قراء القرآن حتی اذا رؤیت بهجته علیه وکان ردائه الاسلام اعتراه الی ماشاء اللہ انسلخ منه و نبذه وراء ظهره وسعی علی

حضرت حذیفہؓ بن یمان فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے جن امور کا اندیشہ ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ایسا آدمی (عالم) ہو گا جو قرآن بہت پڑھے گا۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کی رونق سے پورے طور پر سیراب ہو گا۔ اس کا اوڑھنا بچھونا بھی اسلام ہو گا۔ اللہ تعالےٰ اسے کسی

[1] حافظ ابن حجر عسقلانی۔ بلوغ المرام۔ صہ ۱۵۲

جارہ بالسیف و رماہ بالشرک
قال قلت یا نبی اللہ
ایھما اولی بالشرک المرمی
او الرامی قال بل
الرامی
[1]

ایسے عیب یعنی زعم میں مبتلا کردے گا
کہ قرآنی اثرات اس سے جدا ہو جائیں
گے۔ پھر وہ شخص قرآن کو پس پشت
ڈال کر اپنے معاشرے میں قرب و جوار
کے مسلمان لوگوں کو مشرک قرار دے
گا اور ان کے قتل کے درپے ہو گا۔
حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں۔ میں نے
سوال کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ان دونوں میں سے فی الواقع مشرک
کون ہوگا۔ مشرک کہنے والا یا وہ جس
کو مشرک کہا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔ دوسرے کو مشرک کہنے والا
خود مشرک ہو گا۔

یہ حدیث مسند ابویعلیٰ میں روایت کی گئی ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین اور دیگر آئمہ و محدثین نے اس کے راویوں کو ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے جو اپنی دینداری اور پارسائی کے زعم میں دوسروں کو بے دین اور مشرک قرار دیتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنے انتہا پسندانہ طرزِ عمل سے مسلمانوں میں تفرقہ و انتشار پیدا کر کے اُمتِ واحدہ کا شیرازہ منتشر کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو ان کے انتہا پسندانہ

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۲ صہ ۲۶۵ مطبوعہ مصر

طرزِ فکر و عمل کی وجہ سے مشرک قرار دیا ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی ایسے لوگوں کے بارے میں جو ملت کا شیرازہ منتشر کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے مزعومہ عزائم کی تکمیل کے لیے آیاتِ قرآنی کی معنوی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ ان قرآنی آیات کو جو کفار و مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں بڑی بے باکی اور بے تکلفی سے عام مسلمانوں پر چسپاں کر دیتے ہیں۔

وکان ابن عمرؓ یراھم
شرار خلق اللہ وقال
انھم انطلقوا الیٰ
آیات نزلت فی الکفار
فجعلوھا علی المؤمنین
[1]

ابنِ عمرؓ ان لوگوں کو مخلوقِ خدا میں سب سے
زیادہ شریر تصور کرتے اور فرماتے تھے
کہ یہ ان قرآنی آیات کو جو کفار و مشرکین
کے حق میں نازل ہوئی تھیں بڑی آزادی
اور جرأت مندی کے ساتھ مسلمانوں پر
چسپاں کرتے ہیں۔

ملی شیرازہ بندی کی تعلیم

ارشادِ خداوندی ہوتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ
تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ
بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ
الْبَيِّنَاتُ ط [2]

"اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا
جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف
کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی کہ جب ان
کے پاس روشن نشانیاں آچکی تھیں"۔

یہاں بھی قرآنِ حکیم ملی وحدت اور ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کی تعلیم دے رہا ہے اور بھی متعدد مقامات پر ایسے احکام صادر ہوئے ہیں جن میں

[1] البخاری جلد ۲ صہ ۱۰۲۴ [2] آل عمران - ۳ : ۱۰۵

مسلمانوں کو تفرقہ و انتشار سے اجتناب کرنے اور اتحاد و یک جہتی کو فروغ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اب غور طلب سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی نظر میں فرقہ پرستی اتنی قابلِ مذمت اور انتشار و افتراق کی راہ ہے اور جب ہم سب اس سے متنفر ہیں تو یہ لعنت کیوں ہمارے ملّی وجود کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہی ہے۔ وقت آن پہنچا ہے کہ ہم فرقہ پرستی کی زبانی مذمت پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ اس کے خاتمے کے لیے ایسا لائحہ عمل اختیار کریں جس پر سب مسالک اور مکاتبِ فکر متفق ہو سکیں۔ اور اوائلِ دورِ اسلام کی ملّی وحدت کی یاد کو پھر سے تازہ کر سکیں۔

دورِ جاہلیت اور تفرقہ پروری

قبل از اسلام کا زمانہ دورِ جاہلیت اس لیے کہلاتا ہے کہ اس میں لوگ قبیلوں، گروہوں اور نسل در نسل طبقوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ بہیمیت اور درندگی اپنے عروج پر تھی اور انسانیت جبر و استبداد کی چکّی میں پس رہی تھی۔ ایران اور روم اس وقت کی دو سپر پاورز تھیں جو بے بس انسانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔ اسلام نے آکر مجبور و مقہور انسانوں کو قعرِ مذلّت سے نکالا اور تہذیب و تمدن کی وہ روشن شمعیں عطا کیں جن کی چکاچوند سے مشرق و مغرب کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ تفرقہ پروری کی فضا چھٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک عالمگیر معاشرہ وجود میں آگیا جس نے رنگ، نسل اور مذہب کے سب عصبیتی امتیازات کو یکسر مٹا دیا اور باہمی اخوت و محبّت کا انقلابی نظارہ چشمِ فلک کو دکھا دیا۔ ارشادِ ایزدی ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ — اور اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت یاد رکھو

عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً — جو اس نے تم پر فرمائی جب کہ تم آپس میں

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ — دشمن تھے۔ پس اس نے تمہارے دلوں

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ — میں اُلفت پیدا کر دی تو تم اس کے

اِخْوَانًا [1] — احسان سے بھائی بھائی بن گئے۔"

بعثتِ محمدیؐ اور معجزۂ وحدت و اخوّت

آخر جزیرہ نمائے عرب میں کوہِ فاران کی چوٹیوں سے اس نورِ کامل کا ظہور ہُوا جس نے اُجڈ اور اکھڑ صحرا نشینوں کی کایا پلٹ دی۔ اور وہ لوگ جو زبردست تعصّب اور انتشار کا شکار تھے اور جن کا زیادہ وقت قتل و غارت گری، لوٹ مار اور ایک دوسرے کی عزّت و آبرو لوٹنے میں گزرتا تھا۔ اس قدر باہم شیر و شکر ہو گئے کہ اس کی مثال تاریخِ انسانی میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ عدیم النظیر معجزہ سردرِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ سے رونما ہوا۔ آج بھی عقلیّت پرست دنیا انگشت بدنداں ہے کہ یہ عظیم انقلاب کیسے برپا ہو گیا۔ جس کی بنیاد وحدتِ نسلِ آدم اور اخوت و محبت کی آفاقی قدروں پر قائم تھی۔ اسی معجزے کا ذکر قرآن یوں کر رہا ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ نعمتِ ایزدی یعنی بعثتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تمہاری عداوتیں، محبتوں سے بدل گئیں۔ تمھاری نفرتیں، اُلفتوں سے بدل گئیں۔ تمھاری تنگ نظریاں، قلبی وسعتوں سے بدل گئیں اور تم آپس میں متحد ہو کر یوں شیر و شکر ہو گئے کہ تمھارے باہمی رشتے خونی اُخوت کے رشتوں سے بھی مضبوط تر ہو گئے۔ ایک دوسرے کی جان لینے والے، ایک دوسرے کی جانوں کے محافظ بن گئے۔ دوسروں کی عزتوں سے کھیلنے والے دوسروں کی عزتوں کے نگہبان بن گئے۔ پھر تمھاری عزتیں ایک عزّت میں گم ہو گئیں، تمھاری محبتیں ایک محبت میں گم ہو گئیں۔ اور بالآخر تمھاری منتشر وفاداریاں بھی ایک وحدت میں بدل گئیں۔

---

[1] آلِ عمران ۳ : ۱۰۳

ایک ضروری وضاحت

یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ خدا و رسول نے کسی بھی فرقے اور مسلک کے نام پر جنت کا پروانہ جاری نہیں کیا۔ اگر کوئی اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ محض فلاں مسلک سے متعلق ہونے کی بنا پر جنت کا حقدار ہے تو یہ اس کی خام خیالی اور خود فریبی ہے۔ ایسے تصورات کے پیچھے یہودیوں کی وہی نفسیات کارفرما ہوتی ہے جس کے تحت وہ کہتے تھے کہ جو یہودی ہو گیا اسے جنت کی ضمانت مل گئی۔ جس کی شہادت قرآنِ حکیم نے یوں فراہم کی ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ [1]	"اور انہوں نے کہا کہ جنت میں کوئی بھی داخل نہ ہوگا مگر وہ جو یہودی یا عیسائی ہو گیا۔ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں۔ آپ انھیں فرمایئے کہ کوئی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔"

بخشش اور مغفرت کا دارومدار کسی طبقے یا فرقے کے عنوان کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہر شخص کے ذاتی عقیدے اور عملِ صالح کے باعث خدا کے فضل و کرم پر ہے۔ نجات کی کسوٹی یہ نہیں کہ وہ کس فرقے میں سے ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ خدا و رسول کی تعلیمات کے کتنا قریب ہے۔ سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و اطاعت میں کس قدر سچا ہے اور اپنے فکر و عمل سے دینِ اسلام کا کس قدر متبع اور وفادار ہے؛ یہ حقیقت ہے کہ وحدتِ ملی کے تصور کو فرقہ پرستی کے ہاتھوں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے۔ یہ لعنت ہماری زندگی کے لیے زہرِ ہلاہل کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر ظلم یہ ہے کہ ہم نے اپنے علمی اختلافات و نزاعات

[1] البقرہ ۲ : ۱۱۱

کا موضوع بھی ذاتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنا لیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، موضوعِ اختلاف کیوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات جس سے کامل محبت اور غیر مشروط غلامی و وفاداری کا رشتہ عین ایمان ہے۔ جو رنگ و نسل پر مبنی تفاخر و عصبیت کے تمام بتوں کو توڑنے اور بنی نوع انسان کو تشتت و افتراق سے نجات دے کر ایک دینی وحدت کی لڑی میں پرونے کے لیے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی تھی۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہی ذات آج اپنے نام لیواؤں کے مابین اختلاف و نزاع کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ بارگاہِ مصطفویت سے وابستگی کو بنائے اتحاد بنانے کی بجائے مسلمان اُسے باہمی تفرقہ، مغائرت، مخاصمت اور نفرت کے شعلوں کو ہوا دینے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

؏ بریں عقل و ہمت بباید گریست

کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو محلِ اختلاف بناتا ہے، کوئی آپ کی حقیقت و حیثیت کو، کوئی آپ کے علم و عرفان کو محلِ اختلاف بناتا ہے۔ کوئی آپ کے تصرف و قوت کو، کوئی آپ کی شفاعت و عنایت کو محلِ اختلاف بناتا ہے، کوئی آپ کی سنت و سیرت کو۔ کوئی آپ کے نام کو محلِ اختلاف بناتا ہے اور کوئی آپ کے مقام کو۔

برادرانِ اسلام! آیئے کم از کم ایک عہد تو ہم سب مل کر کریں کہ اختلافات کے ہزاروں دائرے ہو سکتے ہیں۔ ان میں حسبِ ضرورت طبع آزمائی کریں گے۔ مگر ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم جو ہر ایک کی محسن ہے بلکہ محسنِ کون و مکاں ہے، اُسے محلِ نزاع و اختلاف بنانے سے گریز کریں گے۔ مسلمانوں کے مابین خدا،

رسول، دین، قرآن اور کعبہ پر کوئی اختلاف و نزاع گوارا نہیں کیا جانا چاہیے۔

اتحاد و اخوت کے فروغ اور فرقہ پرستی کے خاتمے کا ممکنہ لائحہ عمل

اتحاد و اخوت کے فروغ اور فرقہ پرستی کے خاتمے کے لیے درج ذیل اصول و ضوابط پر مشتمل ایک ہمہ گیر لائحہ عمل تیار کیا جانا چاہیے۔

(۱) عقائد و اعمال کے مشترک پہلو اور بنائے اتحاد۔

(۲) مثبت اور غیر تنقیدی اسلوبِ تبلیغ۔

(۳) حقیقی رواداری کا عملی مظاہرہ اور عدمِ اکراہ کا قرآنی فلسفہ۔

(۴) دینی تعلیم کے لیے مشترکہ اداروں کا قیام۔

(۵) علماء کیلئے جدید عصری تعلیم کا انتظام۔

(۶) تہذیبِ اخلاق کے لیے مؤثر روحانی تربیت کا انتظام۔

(۷) فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کے خاتمے کے لیے چند قانونی اقدامات

i۔ منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی۔

ii۔ تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ علماء پر مشتمل قومی سطح کی سپریم کونسل کا قیام

iii۔ ہنگامی نزاعات کے حل کے لیے سرکاری سطح پر مستقل مصالحتی کمیشن کا قیام۔

iv۔ مذہبی سطح پر منفی اور تخریبی سرگرمیوں کے خلاف عبرتناک تعزیرات کا نفاذ۔

اب مذکورہ بالا لائحہ عمل پر ذرا تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱

عقائد و اعمال کے مشترک پہلو اور بنائے اتحاد

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ تمام اسلامی فرقوں کے درمیان بنیادی و اعتقادی قدریں سب مشترک ہیں۔ اسلامی عقائد کا سارا نظام انہی مشترک بنیادوں پر کھڑا ہے۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی کسی اور نبی یا رسول کی شریعت کا نہ انکار کرتا ہے نہ اسلام کے سوا کسی اور دین کو مانتا ہے۔ سب مسلمان توحید و رسالت، وحی اور کُتبِ سماوی کے نزول، آخرت کے انعقاد، ملائکہ کے وجود حضورؐ کی خاتمیت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت وغیرہ جیسے معتقدات اور اعمال پر یکساں ایمان رکھتے ہیں اور اگر کہیں کوئی اختلاف ہے تو صرف فروعی حد تک اور وہ بھی ان کی علمی تفصیلات اور کلامی شروحات متعین کرنے میں ہے۔ اس سے عقائدِ اسلام کی بنیادوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سب سے پہلی اسلامی ریاست کا قیام

ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکّہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو اس وقت مدینے کا معاشرہ بالعموم مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں پر مشتمل تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت اور قائدانہ حکمتِ عملی سے ان مختلف الخیال عناصر اور متضاد نظریات رکھنے والے طبقوں کو مدینہ کی پہلی اسلامی ریاست کی تاسیس و قیام کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ منشا صرف یہ تھا کہ اس پہلی اسلامی ریاست کی بقا و سالمیت کا فریضہ باہمی اشتراکِ عمل سے سب کو منظم کر کے سرانجام دیا جا سکے تاکہ ریاست کو اندرونی سطح پر کم سے کم مشکلات کا سامنا ہو۔ قرآنِ مجید اس دعوت کو اس طرح بیان کر رہا ہے۔

قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ [1]

آپ فرمایئے اے اہلِ کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔

یہ قرآنی خطاب اہلِ کتاب بالخصوص یہود سے تھا کہ آؤ اس عقیدے کی بنا پر سب اکٹھے ہو جاؤ جو تمہارے اور مسلمانوں کے درمیان قدرِ مشترک ہے اور وہ عقیدہ توحید اور ردِّ شرک ہے جس پر سب الہامی مذاہب کے پیروکار متفق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس دعوتِ اتحاد کے نتیجے میں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ جس کا دستور "میثاقِ مدینہ" کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ اتحاد اس وقت تک عملاً قائم رہا جب تک یہود خود اس کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اگر اسلامی ریاست کے استحکام کی خاطر غیر مسلموں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو ایک نقطۂ اشتراک کی بنیاد پر دعوتِ اتحاد دی جا سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک خدا، ایک نبیؐ اور ایک کتاب، ایک دین اور ایک کعبہ کے ماننے والوں کے درمیان اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اتحاد و یگانگت کے لازوال رشتے قائم نہ کیے جا سکیں اور ملّتِ واحدہ کا تصوّر ایک زندۂ جاوید حقیقت نہ بن سکے۔ لیکن یہ کتنی حرماں نصیبی ہے کہ آج فرزندانِ توحید آقائے دوجہاںؐ کی اس سنّت سے بہت دُور چلے گئے ہیں۔ فرقہ بندی کی عصبیت سے وہ راہِ راست سے بھٹک گئے اور انتشار و افتراق کی گمراہ کن راہوں میں کھو گئے ہیں انہیں اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے مابین سب بنیادی قدریں مشترک تھیں۔ اسلام کی بالادستی اور حاکمیتِ مصطفویؐ کے آگے ظاہراً سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے یہودیوں نے بھی آقائے نامدار کی دعوتِ اتحاد کو سیاسی مصلحتوں کی خاطر ہی سہی قبول کر لیا تھا۔

[1] آلِ عمران ۳ : ۶۴

لیکن آج کے مسلمان تو عملاً یہود سے بھی آگے گزر گئے ہیں کہ اپنے گروہی، مسلکی، جماعتی اور طبقاتی مفادات کی خاطر انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمِ وحدت کا اتنا بھی پاس نہیں رہا کہ اسلام کی کشتی میں سوار ہر فرقہ کشتیِ ملّت کے تختوں کو اکھاڑ اکھاڑ کر سمندر میں پھینک رہا ہے اور کسی کو اتنا بھی خیال نہیں کہ اگر خدانخواستہ یہ کشتی ڈوب گئی تو وہ بھی سب اس کے ساتھ غرق ہو جائیں گے۔

یاد رہے کہ اصولِ توحید کی بنا پر دعوتِ اتحاد اسلام نے غیر اسلامی الہامی مذاہب بالخصوص یہودیت کو دی تھی۔ انہیں رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کی دعوت اس لیے نہیں دی جا سکتی تھی کہ یہی ان کے اور اسلام کے مابین وجہِ تفریق تھی۔ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کی نبوّت کے وفادار ہو جاتے تو یہودی کس طرح رہ سکتے تھے۔ لہٰذا کسی ایسے اصول کو ہی دعوت کے لیے اپنایا جا سکتا تھا جس کے ذریعے وہ یہودی رہتے ہوئے بھی اس اتحاد میں شریک ہو سکتے اور وہ اصول خدا پرستی کا عقیدہ تھا جس کے دونوں دعویدار تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا تعلق ہے اس کے لیے عقائد و اعمال کی ساری بنیادیں مشترک ہیں توحید، رسالت، ختمِ نبوت، آخرت، قرآن اور وحدتِ کعبہ سے لے کر ارکانِ اسلام تک سب کچھ مشترک ہے اور ان میں امتِ محمّدی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کا وہ لازوال باہمی رشتہ بھی موجود ہے جو بیک وقت مسلمانوں کے لیے بنائے اتحاد و یگانگت اور غیر مسلموں کے لیے بنائے امتیاز و مفارقت ہے۔ آخر ان اقدار کی بنا پر ملّتِ اسلامیہ کیوں ایک وحدت نہیں بن سکتی؟

مثبت اور غیر تنقیدی اسلوبِ تبلیغ

اس ضمن میں بُنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تبلیغ کے لیے موضوع کیا ہونا چاہیئے اور کون سا انداز و اسلوب اختیار کیا جائے جسے دعوت و تبلیغ کے کام کو مربوط اور مشترک بنیادوں پر سرانجام دینے کے لیے تمام مسالک و مکاتبِ فکر یکساں طور پر اپنا سکیں۔

دعوت و تبلیغ کے موضوعات

تبلیغی کام کو درج ذیل موضوعات کے ساتھ مختص کر دینے سے فرقہ وارانہ کشیدگی، طبقاتی تناؤ اور باہمی آویزش کو ختم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ا۔ اعتقادی زندگی کے اصلاح طلب پہلو۔

ب۔ عملی زندگی کے اصلاح طلب پہلو۔

ج۔ اخلاقی و رُوحانی زندگی کے اصلاح طلب پہلو۔

ا۔ اعتقادی زِندگی اصلاح طلب ہے

عقیدہ ہر انسان بالخصوص مسلمان کے تمام اعمال کی اساس ہوتا ہے۔ اس میں بگاڑ یا اختلال واقع ہو جائے تو اس کے اثرات پوری زندگی کے افعال و اعمال پر مترتب ہوتے ہیں۔ بحمداللہ مسلمانوں کے تمام مسالک اور مکاتبِ فکر میں عقائد کے بارے میں کوئی بنیادی اختلاف موجود نہیں ہے البتہ فروعی اختلافات صرف جزئیات اور تفصیلات کی حد تک ہیں جن کی نوعیت تعبیری اور تشریحی ہے۔ اس لیے تبلیغی اُمور میں بنیادی عقائد کے دائرہ کو چھوڑ کر محض فروعات و جزئیات میں اُلجھ جانا اور ان کی بنیاد پر

٦

دوسرے مسلک کو تنقید و تفسیق کا نشانہ بنانا کسی طرح دانشمندی اور قرینِ انصاف نہیں ۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے عقائد مردہ اور بے جان ہو چکے ہیں۔ انھیں ہماری عملی زندگی میں "توہمات" سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں دیا جارہا۔ عقیدۂ توحید ہو یا عقیدۂ رسالت، تصورِ آخرت ہو یا تصورِ جزا و سزا ان میں دراڑیں پڑ چکی ہیں ۔ ذہن، عقائد کے بارے میں بھی پراگندہ خیالی اور تشکیک کا شکار ہیں ۔ قلوب و اذہان کو مومنانہ یقین میسر نہیں، خدا پر ایمان رکھنے کے باوجود اس پر بھروسہ اور توکل باقی نہیں رہا۔ ہم عقائد کا تحفظ کلامیات اور مناظرانہ استدلال سے کرتے ہیں جو زندگی کو دولتِ یقین عطا نہیں کر سکتا۔ کتاب و سنت کے قابلِ عمل اور عصرِ حاضر میں نتیجہ خیز ہونے پر بھی ہمارا ایمان متزلزل ہو چکا ہے ۔ ہم کفر کے مقابلے میں اسلام اور باطل کے مقابلے میں حق کے کامیاب و کامران ہونے پر بھی اعتقاد ختم کر بیٹھے ہیں ۔ الغرض ہمارے عقائد کا سارا ایوان متزلزل اور ڈانواں ڈول ہے لہٰذا اس وقت ہمیں عقائد کے کلامیاتی پہلوؤں پر زیادہ زور دینے کے بجائے عقائد کے ان ایمانیاتی اور انقلابی پہلوؤں پر زور دینا چاہیئے جن سے مُردہ عقائد پھر سے زندہ ہو جائیں اور ان کا تعلق حقیقی زندگی کے ساتھ پھر سے بحال ہو جائے تاکہ عملی زندگی ان عقائد کے اثرات و برکات سے صحیح معنوں میں فیضیاب ہو سکے ۔ اگر علماء و خطباء اس رُخ پر توجہ کریں تو وہ خود محسوس کریں گے کہ اس انداز کی تبلیغ و تقریر بے شمار تنازعات اور اختلافات سے از خود پاک ہو جائے گی اور اگر وہ بعض اوقات عقائد کے بعض پہلوؤں کی وضاحت میں علمی اختلاف کو ناگزیر سمجھیں تو اُن کا بیان بھی محض مثبت طریقے سے کتاب و سنت کی روشنی میں اس طرح کر دیا جائے کہ کسی

دوسرے مکتبِ فکر کا نقطۂ نظر موردِ طعن نہ بنے۔

ب۔ عملی زندگی اصلاح طلب ہے

اعتقادی زندگی کے بعد عملی زندگی ہماری خصوصی توجہ کی محتاج ہے

ہمارے موجودہ اعمال کی حقیقت ہم سے ڈھکی چھپی نہیں۔ مسلم معاشرہ کس حد تک مسلسل بگاڑ کا شکار ہو چکا ہے یہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ انفرادی سطح ہو یا اجتماعی سطح ہماری عملی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جو فساد اور بدعنوانیوں کی زد میں نہیں ہے۔ قول و فعل میں تضاد، منافقت، ریاکاری، تصنّع، کذب و افتراء روزمرہ معاملات میں فریب دہی، عیّاری، مکّاری اور چالبازی نے ہماری پوری کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے. تبلیغ کے لیے یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کسی مسلک کے درمیان اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اصلاحِ معاشرہ کا اجتماعی فریضہ تمام فرقوں کے مسلمانوں پر بلا لحاظ مسلک و عقیدہ یکساں طور پر عائد ہوتا ہے۔ معاشرتی اور سماجی برائیوں اور خرابیوں کے خلاف ہمہ گیر جہاد وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جس میں مسلک سے قطع نظر تمام مسلمانوں کو مل کر حصہ لینا چاہیئے۔ لہٰذا تبلیغ و تقریر کا دوسرا موضوع یہ ہو جانا چاہیئے کہ ہماری زندگی کا بگڑا ہوا بلکہ تباہ شدہ عملی ڈھانچہ کس طرح سنوارا جا سکتا ہے؟

ج۔ اخلاقی زندگی اصلاح طلب ہے

اجتماعی سطح پر اخلاقیات اور روزمرہ عادات و اطوار کے

اعتبار سے ہماری زندگی اس قدر انحطاط اور زبوں حالی کا شکار ہو چکی ہے اور ہماری اخلاقی و روحانی اقدار اس درجہ اتھل پتھل ہو چکی ہیں کہ آج کی نسل کا اسلام سے بیزار ہو کر برگشتہ ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے اخلاق و شرافت اور انسانی قدروں کے دعویدار ہوں یا دینوی

جاہ و منصب پر فائز ایثار و قربانی کا درس دینے والے زعماء، آپ اگر ان کے
باطن میں جھانکیں تو الا ماشاء اللہ وہ خود غرضی، جاہ طلبی، خواہشاتِ نفسانی
اور ان تمام آلائشوں میں ملوث نظر آئیں گے جو انسانیت کے دامن پر بدنما
داغ ہیں۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جدید نسل کی بڑھتی ہوئی گمراہی اور
بے راہ روی کے ذمہ دار اتنے الحاد و لادینیت کا پرچار کرنے والے نہیں جتنے
کہ اسلام کی تبلیغ کرنے والے مبلغ اپنے کردار کی گراوٹ اور فکر و عمل کے تضاد
کی وجہ سے ہیں۔ للذا اولین ضرورت یہ ہے کہ اصلاح کے ان پہلوؤں کو موضوعِ
تبلیغ بنایا جائے۔

اسلام کی حکیمانہ تعلیم

قرآنِ حکیم میں باری تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد
فرماتے ہیں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ [1]

"اے محبوب اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت سے بلائیے اور ان سے جدال بھی اس انداز سے کیجئے کہ جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو۔"

اس آیتِ کریمہ میں فروغِ اخوت کے لیے حکیمانہ پہلو یہ ہے کہ دعوت
اور تبلیغ کا مقصد چونکہ برائیوں کی اصلاح اور اچھائیوں کی تلقین ہوتا ہے،
اور یہ حقیقت ہے کہ جب کسی شخص کی کسی برائی کی نشاندہی کی جاتے، خواہ
وہ اعتقادی ہو یا علمی و اخلاقی۔ تو وہ اُسے ناپسند کرتا ہے اور ردِعمل کے طور

[1] النحل ۱۶ : ۱۲۵

پر کبھی مخالفت بھی کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ خرابی کی اصل جڑ وہ نفسِ امارہ
اور شیطنت" ہوتی ہے۔ جو اصلاح کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹ پیدا
کرتی ہے۔

لہذا حکم یہ دیا گیا ہے کہ دعوت و تبلیغ میں انتہاء درجے کی حکمت و
موعظمت پیش نظر رہنی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دعوت و تبلیغ میں
معمولی سی بے حکمتی کے باعث اصلاح کی بجائے، پہلے سے موجود اخوت
اور دوستی کا رشتہ ہی کٹ جاتے۔ اس طرح تبلیغ فروغِ اخوت کی جگہ فروغِ
نفاق کا سبب بن جاتے گی۔ اور یہ بات فی نفسہ ایک برائی ہے۔ سرورِ کائنات
کی پوری زندگی اس آیت کی عملی تفسیر تھی۔ مسلمان تو درکنار کافروں اور
مشرکوں سے بھی آپ کا رویہ اور طرزِ عمل انتہائی حکمت و موعظت اور فہم و
بصیرت سے عبارت تھا۔ قرآنِ مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ کافروں
کے بتوں کو بھی ——— گالی نہ دیں کہ ردِعمل کے طور پر وہ بھی خدا
اور رسول کی شان میں ویسے ہی نازیبا کلمات کہیں گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ [1]

اور تم انہیں گالی نہ دو، جن کی اللہ کے سوا یہ پرستش کرتے ہیں۔ (کہیں ایسا نہ ہو) کہ وہ بھی زیادتی کرتے ہوئے جہالت کی وجہ سے اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں

[1] الانعام ۶ : ۱۰۸

آیۂ کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ تبلیغِ حق کے وقت ردِّ کفر اور ابطالِ باطل کے باوجود کفار کے جھوٹے معبودوں کو گالی دینے پر قدغن لگائی جارہی ہے ۔ اس فرمانِ خداوندی کی تہہ میں حکمت یہ ہے کہ کفار بزعمِ خویش اپنے آپ کو باطل پر نہیں سمجھتے ۔ اگر آپ ان کے جھوٹے معبودوں کو گالی دینگے تو وہ جواب میں آپ کے سچے معبود پر دشنام طرازی کریں گے ۔ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے ۔ کہ ایک بار حضورؐ نے صحابہ سے فرمایا ۔ بدبخت ہے وہ شخص جو اپنے ماں باپ کو گالی دیتاہے" صحابہ نے دریافت کیا "یا رسول اللہ ایسا کون ہے جو اپنے ماں باپ کو گالی دے" حضورؐ نے فرمایا کہ وہ شخص جو کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور دوسرا جواباً اس کے ماں باپ کو گالی دے تو یہ سمجھ لے کہ وہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دے رہا ہے ۔ [1]

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی پر لعنت بھیجتا ہے یا کفر کا طعنہ دیتا ہے ۔ اور وہ اس کا مستحق نہیں ہوتا تو وہ لعنت اور کفر خود اسی کی طرف لوٹ آتے ہیں ۔ [2]

---

[1] ۔ حدیث پاک کے الفاظ یہ ہیں ۔ عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الکبائر شتم الرجل والدیہ قالوا یارسول اللہ و ھل یشتم الرجل والدیہ قال نعم یسب ابا الرجل فیسب اباہ ویسب امہ فیسب امہ ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ۴۱۹، باب البر والصلہ)

[2] ۔ ــــــــــــ عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما رجل مسلم اکفر رجلاً مسلماً فان کان کافرا والا کان ھو الکافر ۔

(ابوداؤد ۲: ۲۸۸)

ایک مشہور حدیث ہے جسے امام ابن کثیر نے تفسیر ابن کثیر میں درج کیا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا ۔ جب کوئی مبلّغ جس کا سونا جاگنا اور اوڑھنا بچھونا سب کچھ اسلام ہوگا اور وہ ہمہ تن اسلام کے لبادے میں ملبوس دکھائی دے گا ۔ ہمہ وقت دین کی تبلیغ میں مشغول ہوگا ۔ لوگ اس کو بہت بڑا عالم سمجھیں گے ۔ اور وہ بھی بزعمِ خویش اپنے آپ کو اسلام کا اجارہ دار سمجھے گا ۔ باری تعالیٰ اسے کسی عیب میں مبتلا کر دیں گے اور وہ میری اُمت کے لوگوں کو کافر و مشرک کہے گا ۔ ان کے درپے آزار ہوگا ۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت فرمایا "یا رسول اللہ کیا وہ شخص جن کو کافر و مشرک کہے گا ۔ واقعی ایسے ہوں گے" ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں بلکہ وہ بدبخت خود دائرۂ اسلام سے خارج ہوگا ۔ [1]

آؤ ذرا ہم اپنی حالت پر غور کریں اور سوچیں کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو بغیر سوچے سمجھے ایک دوسرے کو کافر، مشرک، بدعتی، گستاخِ رسول، لعنتی اور جہنمی کہہ رہے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ اس تکفیر و تفسیق کی زد میں اگر سارے آ گئے تو پھر مسلمان کون بچے گا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری

---

[1] ــــــــــــ حدیث کے الفاظ یہ ہیں ۔ عن حذیفۃ بن الیمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مما اخاف علیکم رجل قرء القرآن حتی اذا روئیت بھجتہ علیہ وکان رداءہ الاسلام اعتراہ الی ماشاء اللہ انسلخ منہ ونبذہ وراء ظھرہ وسعیٰ علی جارہ بالسیف ودماہ بالشرک قال قلت یا نبی اللہ ایھما اولیٰ بالشرک المرمی او الرامی قال بل الرامی

(تفسیر ابن کثیر ۲: ۲۶۵)

اُمّت کے رگ و ریشے میں توحید اس درجہ سرایت کر چکی ہے کہ مجھے ان کے دوبارہ شرک کی طرف لوٹ جانے کا مطلق اندیشہ نہیں ۔

کلمہ گو کو بلا جوازِ شرعی کافر نہ کہو

جس شخص نے کلمہ پڑھ لیا اسے کافر کہنا بغیر شرعی حجت کے کسی طرح بھی روا نہیں ہے ۔ ایک جنگ میں کسی صحابی نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا ۔ جس کے بارے میں بیان کیا گیا کہ اس نے مرنے سے پہلے کلمہ پڑھ لیا تھا ۔ حضورؐ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو آپؐ نے اس صحابی کو طلب کر کے پوچھا کہ تم نے فلاں شخص کو کیوں قتل کیا ۔ درانحالیکہ اس نے میرا کلمہ پڑھ لیا تھا ۔ صحابی نے کہا کہ حضور اس نے دل سے نہیں بلکہ کلمہ دکھاوے کے لئے اور اپنی جان بچانے کے لئے پڑھا تھا ۔ اس پر رحمتِ عالمؐ نے فرمایا کہ تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا ۔ کہ اس نے کلمہ دکھاوے کے لئے پڑھا ہے[1] اس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو گیا کہ دل کا حال خدا اور اس کے اعلام سے اس کے رسول کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ اب کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں کلمہ گو، منافق اور کافر ہے اپنے آپ کو خدا اور رسول کے مسند پر بٹھانے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے ؟

مخلوق میں صرف حضورِ رسالتمآبؐ ہی کامل مخبرِ صادق ہیں

ربّ العٰلمین نے اپنے پیارے نبی کو قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات سے باخبر

[1] حدیث کے الفاظ یہ ہیں ۔
افلا شققت عن قلبہ حتی تعلم من اجل ذلک قالھا ام لا
(ابوداؤد ۱ ، ۳۵۵ کتاب الجہاد)

کر دیا اور تمام انسانوں کے ظاہری و باطنی اعمال ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ظاہر کر دیئے ۔ تاکہ وہ ان کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہو کر مؤثر طریق پر ان کی اصلاح اور علاج کر سکیں ۔

ارشادِ باری تعالےٰ ہے :

قُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۔[1]

فرما دیجئے کہ عمل کرو، پس عنقریب تمہارے اعمال اللہ اس کا رسول اور مومنین دیکھ لیں گے ۔

روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ پر یہ حقیقت منکشف کر دی گئی ہے کہ کون مومن ہے اور کون کافر ۔ جب یہ بات منافقوں نے سنی تو تمسخر آمیز انداز میں طعنہ زنی کرنے لگے کہ یہ کیسا رسول ہے جو قیامت تک کے حالات سے آگاہ ہونے کا دعوے کرتا ہے ۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ ہم کیا ہیں

حدیث کے الفاظ ہیں :

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عرضت علیّ اُمتی فی صورھا کما عرضت علی آدم واعلمت من یؤمن بی ومن یکفر بی فبلغ ذالک المنافقین

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، آدم علیہ السلام کی طرح مجھ پر میری اُمّت اپنی صورت میں پیش کی گئی اور مجھے بتا دیا گیا کہ کون میرے ساتھ ایمان لائے گا اور کون کفر کرے گا ۔ یہ بات

[1] ۔ التوبہ ۹ : ۱۰۵

فقالوا استهزاء زعم محمد انه يعلم من يؤمن به و من يكفر ممن لم يخلق بعد و نحن معه وما يعرفنا فبلغ ذالك رسول الله صلى الله عليه وسلم و قام على المنبر فحمد الله تعالى واثنى عليه ثم قال ما بال اقوام طعنوا في علمي لا تسئلوني عن شيئ فيما بينكم و بين الساعة الا نبأتكم به فقام عبد الله بن حذافة السهمى فقال من ابي يا رسول الله فقال حذافة فقام عمر فقال يا رسول الله رضينا بالله ربا و بالاسلام دينا و بالقرآن اماما و بك نبينا فاعف عنا عفا الله عنك فقال النبي صلى الله عليه وسلم

منافقوں تک پہنچی تو انہوں نے استہزاء کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال ہے کہ وہ تمام مومنین و کافرین کو جانتے ہیں جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوتے۔ اور ہم ان کے پاس ہیں لیکن وہ ہمیں نہیں پہچانتے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ منبر پر کھڑے ہوگئے۔ اللہ تعالے کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ جنہوں نے میرے علم کے بارے میں طعنہ زنی کی قیامت تک جس چیز کے بارے مجھ سے سوال کروگے میں تمہیں بتادوں گا۔ عبد اللہ بن حذافہ السہمی کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ میرا باپ کون ہے۔ آپ نے فرمایا حذافہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ہم اس پر راضی ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ اسلام ہمارا دین۔ قرآن ہمارا

فهل انتم منتهون - فهل انتم منتهون [1]

امام ہے اور آپ اللہ تعالے کے نبی ہیں۔ آپ ہم سے درگزر فرمائیں اللہ تعالے آپ سے درگزر فرماتے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم باز نہیں آؤگے؟ کیا تم باز نہیں آؤگے؟

حضرت ابو موسیٰ رضی کی روایت میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ثم قال للناس سلوني عما شئتم [2]

پھر آپ نے لوگوں سے کہا جس چیز کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے پوچھو۔

حضرت انس رضی کی روایت میں ہے۔

فقال لا تسئلوني اليوم عن شيئ الا بينته لكم [3]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آج تم جس چیز کے بارے میں مجھ سے پوچھوگے میں تمہیں بیان کرونگا۔

زہری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

قال من احب ان يسأل عن شيئ فليسأل فوالله لا تسئلوني عن شيئ الا

آپ نے فرمایا جو کسی چیز کے بارے میں سوال کرنا چاہتا ہے۔ وہ پوچھ لے تم جس چیز کے متعلق بھی

---

[1] تفسیر خازن، ۱/ ۳۲۸
[2] الصحیح البخاری ۱ : ۱۹
[3] الصحیح البخاری ۲ : ۹۴۱

اخبرتکم بہ مادمت فی
مقامی ھذا فاکثر الناس
البکاء واکثر ان یقول
سلونی - قال انسؓ فقام
الیہ رجلؓ فقال این
مدخلی یارسول اللہ قال
النار - [1]

مجھ سے پوچھو گے تمہیں بتاؤں گا
جب تک میں اس جگہ ہوں -
لوگوں نے زاروقطار رونا شروع
کر دیا - اور آپ بار بار یہی فرماتے
رہے مجھ سے سوال کرو مجھ سے سوال
کرو، حضرت انسؓ فرماتے ہیں تب
ایک شخص اٹھا اور پوچھنے لگا، یا
رسول اللہ بعد از مرگ میرا ٹھکانہ کہاں
ہوگا؟ آپ نے فرمایا دوزخ

سوال یہ ہے کہ کیا مخلوق میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا
کسی اور کو ایسا دعویٰ کرنے کا حق پہنچتا ہے ہرگز نہیں - یہ منصب صرف
کائنات کے اس رسولِ اعظم کا ہے جس کے دائرہ نبوت سے نہ کوئی زمان
باہر ہے اور نہ کوئی مکان - مگر اس کے علاوہ کسی اور شخص کی زبان ایسا وسیع
دعویٰ نہیں کر سکتی - کیونکہ باطن اور آخرت کے حالات سے توفی الحقیقت وہی
علام الغیوب ہی واقف ہے یا وہ پیکرِ نبوت جسے باری تعالےٰ نے اپنے خزانہ
علم سے دولتِ وافر عطا کی ہے -

اب اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے باطن اور نیت پر شک کرتے
ہوئے بغیر کسی ظاہری شہادت کے اسے منافق کافر و مشرک یا جہنمی اور دوزخی
قرار دے گا تو یہ دعویٰ یا تو "شرک فی التوحید" کے مترادف ہوگا یا "شرک
فی النبوت" کے - مسلمانوں کو یقینی علم کے بغیر دوسروں کی نسبت حسنِ ظن یعنی

---

[1] - الصحیح البخاری ۱: ۷۷، ۲: ۱۰۸۳،

نیک گمان رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے - کیونکہ نیک گمان سے اخوت
اور اتحاد قائم ہوتا ہے جبکہ بدگمانی نفاق اور افتراق
کا باعث بنتی ہے -

نصوصِ قرآن و سنت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دین میں رخنہ
اندازی اور تفرقہ پروری صریحاً کفر کے مترادف ہے اس لئے ہر مکتبِ فکر سے
تعلق رکھنے والے علماء کو صرف بنیادی اُمور پر توجہ مرکوز کرنی چاہیئے اور حتی
الامکان فروعی معاملات میں ایک دوسرے سے نہیں اُلجھنا چاہیئے - تبلیغ
و دعوت کا موضوع اور اسلوب ایسا ہو جس سے کسی مسلک کے بزرگ کی کردار
کشی اور تنقیص و تذلیل کا پہلو نہ نکلے بلکہ مسائل کی تشریح و تعبیر قرآن و سنت
کی روشنی میں خالصتاً علمی فکری اور تعمیری نقطۂ نظر سے کی جائے -

---

۳

حقیقی رواداری کا عملی مظاہرہ

اور

عدمِ اکراہ کا قرآنی فلسفہ

قرآنِ حکیم میں ارشادِ ربانی ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ	دین میں کوئی زبردستی نہیں۔
قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ	بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہو چکی ہے۔

مندرجہ بالا آیۂ کریمہ میں باری تعالیٰ نے دینِ اسلام کے عمومی مزاج کو بیان کیا ہے یعنی دین کے اندر کسی قسم کا جبر، تنگی اور سختی نہیں ہے۔ دین کی پوری عمارت لا اکراہ کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے اور اشاعت و توسیعِ اسلام میں یہی اصول ابتدا تا ہنوز کارفرما رہا ہے۔ آیۂ کریمہ کے پہلے حصے میں بڑی صراحت کے ساتھ اس اصول کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اور دینی تعلیمات کا سارا نظام اسی اصول کے گرد گھومتا ہے۔ تاریخِ اسلام اس بات پر شاہدِ عادل ہے کہ کرۂ ارض پر اسلام بالجبر اور بزورِ شمشیر نہیں پھیلا بلکہ کردار و عمل کی قوت اور حکمت و موعظت سے لوگوں کے قلوب مسخر کرتا چلا آیا ہے۔ آیۂ مقدسہ کے دوسرے حصے میں رشد و ہدایت اور گمراہی و ضلالت کا واضح طور پر ایک دوسرے سے ممیز ہونا بیان کیا گیا ہے۔ حق و باطل اور صدق و کذب کی جداگانہ راہوں کی واضح طور پر نشان دہی کر دی گئی ہے اور ہر کس و ناکس کو پورا اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اس پر کسی قسم کا جبر یا زبردستی نہیں ہوگی۔ ہر انسان اپنے لئے زندگی کا راستہ و طریق منتخب کرنے میں کلی طور پر آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ جبر و زیادتی سے اپنا راستہ اور طریق

زندگی دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کرے۔ ہاں البتہ حکمت وموعظت اور تبلیغ و تلقین سے کسی کو قائل کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔ آپ اعلان فرما دیجئے کہ ہم نے دین کی تعلیمات واضح کر دی ہیں۔ اور آپ کی ذمہ داری بس اتنی ہے کہ جو کچھ ہماری طرف سے عطا ہوا ہے وہ دوسروں تک احسن طریقے سے پہنچا دیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ

الکہف ۱۸ ، ۲۹

اور (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے۔

یعنی پیغامِ حق پہنچا دینے کے بعد بحیثیت پیغمبر و رسول آپ کی قطعاً کوئی ذمہ داری نہیں کہ کوئی آپ کی دعوت قبول کرتا ہے یا نہیں

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کفر و ایمان کے بارے میں تم پر اپنی مرضی اور مشیّت مسلّط کرنا چاہتا اور تم سے اختیار کی قوت سلب کر لیتا تو اس کی رضا و مشیّت کے آگے کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ اگر وہ چاہتا تو روئے زمین پر ایک بھی کافر نہ رہتا۔ لیکن اس قادرِ مطلق کی مشیّت یہی ہے۔ کہ دنیا میں کفر و اسلام، حق و باطل، خیر و شر، نیکی اور برائی کی جدا جدا راہیں متعین کر دی جائیں اور انسان کو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینے کا اختیار تفویض کر دیا جائے۔ اس طرح اس نے رسولوں اور نبیوں کے ذریعے گم کردہ راہ انسانیت کی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں

تک کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سلسلہ تکمیل کو پہنچا جن کا اسوہ زمان و مکان کی حدود سے ماوراء تمام نوعِ انسانی کے لئے مکمل نمونۂ حیات ہے۔ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ [1]

ہم نے (خیر اور شر کے) دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا [2]

پھر اس (نفس) کے دل میں اسکی نافرمانی اور اسکی پارسائی کو ڈال دیا ہے۔

گویا دین سے عنصرِ جبر خارج کر کے ہر شخص کو شعور کی دولت سے بہرہ ور کر دیا گیا۔ اسے ردّ و قبول کا حق دیا گیا کہ وہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھے۔ اور برضا و رغبت جو دین چاہے اختیار کرے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جزا و سزا عذاب و ثواب کا تصوّر بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ دین کی راہ واضح طور پر متعین کر دینے کے بعد خدائے بزرگ و برتر نے کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ مذہب کے بارے میں کسی پر پابندی عائد کرے یا کسی کی آزادی پر کوئی قدغن لگائے۔

مقصدِ بعثتِ نبوی

نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ [3]

(نبی اکرمؐ ان لوگوں) کا بوجھ اتارتے ہیں اور وہ زنجیریں (کاٹتے ہیں) جو انہیں جکڑے ہوئے تھیں

[1] البلد ۹۰ : ۱۰ [2] الشمس ۹۱ : ۸ [3] الاعراف ۷ : ۱۵۷

حضورِ اکرمؐ نے فرمایا کہ میں بڑا سیدھا سادا آسان دین لے کر مبعوث ہوا ہوں - ظہورِ اسلام سے پہلے انسانیت ناروا پابندیوں اور جبر و ستم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور مجبور و مقہور انسان ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہے تھے - محکومی و غلامی کے عالم میں انسان جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے - اسلام نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیا اور سب ناروا پابندیوں کو یکسر ختم کر دیا - حضور اکرم نے اپنی تبلیغی زندگی میں یہ بنیادی اور ناقابلِ تغیّر اصول بطور معیار اپنایا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت یا عدمِ اطاعت کے بارے میں جبر و اکراہ کا کوئی عمل و دخل نہ ہو -

قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے -

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝ [1]

اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ تعالےٰ کی اطاعت کی اور جس نے (اس اطاعت سے) منہ پھیرا تو ہم نے آپ کو ان کا پاسبان بنا کر نہیں بھیجا -

یعنی اگر کوئی دعوتِ اسلام قبول کر لیتا ہے تو وہ ہدایت پا گیا اور اگر وہ اسے قبول کرنے سے انکاری ہے تو آپ بری الذمہ ہیں - آپ نے اپنا فرض پورا کر دیا لوگوں کو بالجبر دائرہ اسلام میں داخل کرنا آپ کے منصب

[1] النساء ۴ : ۸۰

رسالت میں شامل نہیں - اسلام کی پوری تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ کسی بھی دور میں تبلیغی مساعی کے دوران کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی شخص کو زبردستی یا بزورِ شمشیر مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا ہو - اسلام میں عُسرت اور تنگی نہیں بلکہ فراخی اور آسانی ہے - یہاں تک کہ اضطراری حالت میں لقمۂ حرام کھا کر بھی جان بچانا جائز ہے، ارشاد ہوتا ہے -

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ [1]

لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں -

قرآنِ کریم کی ان آیاتِ مقدسہ اور سنتِ نبوی سے یہ نکتہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ دینِ متین کی تبلیغ اور دعوتِ حق میں زبردستی اور جبر کا عنصر منشائے خداوندی کے سراسر منافی ہے - اسی اصول پر حضور نبی اکرمؐ، آپ کے جاں نثار صحابہ اور آپ کے بعد آنے والے صلحائے اُمت ہمہ وقت کاربند رہے - اب کسی واعظ اور مبلغ کو منبر پر کھڑے ہو کر یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی پر اپنا مسلک اور نقطۂ نظر زبردستی مسلط کرے اور اختلافِ رائے رکھنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتا پھرے -

اختلافِ رائے کا بنیادی حق

اسلام کی رُوح میں مشاورت و جمہوریت کار فرما ہے وہ تمام انسانوں سے مساوات اور برابری کی سطح پر مخاطب ہوتا ہے - آقائیت اور پاپائیت کا تصور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں - مزید برآں دعوتِ دین اور تبلیغِ حق

[1] البقرہ ۲ : ۱۷۳

کا فریضہ ادا کرتے ہوئے شائستگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا کبیر
روا نہیں ۔ اسلام کی رواداری اور وسیع المشربی جو اس بات کی متقاضی ہے
کہ مخالفین کے نقطۂ نظر کو تحمل، خندہ پیشانی اور قوتِ برداشت سے سُنا جائے
اور کسی پر زبردستی اپنی بات نہ ٹھونسی جائے ۔ خالقِ کون و مکان نے
جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ دین کے
معاملے میں کسی پر اپنی مرضی مسلّط کریں تو کسی مبلّغ کو یہ حق کہاں سے حاصل
ہو گیا کہ وہ دوسروں سے اختلافِ رائے کا حق چھین لے ۔ مخالفین پر عرصۂ حیات
تنگ کرے اور ان کے اسلام اور ایمان پر زبانِ طعن دراز کرتا پھرے ۔

اختلافِ رائے کا حق اسلام کے تصورِ شورائیت اور جمہوریت کا جزو لاینفک
ہے ۔ حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے واضح ہے کہ آپ اہم امور میں اپنے صحابہ
سے مشورہ لیتے اور اختلافِ رائے کا احترام بھی کرتے تھے ۔ جیسا کہ غزوۂ احد
کے موقعہ پر حضور نے اپنی رائے کے برعکس صحابہ کی رائے کے مطابق مدینہ کی
حدود سے باہر جنگ لڑنے کا فیصلہ فرمایا ۔ اس طرح حضور نے اپنے عمل سے
تعلیمِ اُمّت کے لئے ایک ایسا اصول متعین کر دیا جس کی تقلید بلا امتیاز
تمام مسلمانوں کے لئے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے ۔

اس ضمن میں ایک صحابیہ کا واقعہ پیش نظر رہے[1] جو اپنے شوہر سے علیحدگی

---

[1] حدیث یہ ہے ۔ عن ابن عباس ان مغیثا کان عبداً فقال یا رسول اللہ اشفع لی الیہا (بریرۃ) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا بریرۃ اتقی اللہ فانہ زوجک وابو ولدک فقالت یا رسول اللہ اتأمرنی بذالک قال لا انما انا شافع وکان دموعہ تسیل علی خدہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للعباس الا تعجب من حب مغیث بریرۃ وبغضہا ایاہ ۔
(ابوداؤد ۱: ۳۰۳)

کی خواستگار تھی اور اس کا شوہر اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا ۔ صحابیؓ نے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ
آپ اُسے فرمائیں کہ مجھ سے جُدا نہ ہو ۔ میں اسے اپنے عقد میں رکھنا چاہتا ہوں ۔
حضور نے اس صحابیہ کو طلب کیا اور پوچھا کہ تو اپنے شوہر سے کیوں جدا ہونا
چاہتی ہے اور پھر فرمایا کہ تو اس سے اپنا عقدِ نکاح برقرار رکھ ۔ صحابیہؓ نے
دریافت کیا یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ اگر یہ مشورہ ہے تو مجھے اپنا
حق استعمال کرنے کی اجازت دی جائے ۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے
اپنا حق استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ جا شریعت نے اس بارے
میں تجھے کلّی اختیار دیا ہے ۔ حضور کی سنت کے یہ نظائر بیان کرنے کا مقصد
دل و دماغ میں یہ تصوّر جاگزین کرنا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام
دہی میں دوسروں کو اختلاف کا حق دینا خود حضور کی سنتِ مبارکہ اور سیرتِ
طیبہ سے ثابت ہے ۔

۴
دینی تعلیم کے لیے مشترکہ اداروں کا قیام

مذہبی رواداری سے متعلق ایک اور اہم اصول جو غور و فکر اور توجہ کا محتاج ہے وہ علمائے کرام اور مبلّغین کی تعلیم و تربیت کے لئے ایسے دینی اداروں کے قیام و انصرام سے متعلق ہے - جہاں مسلکانہ تنگ نظری سے ماوراء ہو کر ہر مسلک و مکتبِ فکر کا طالب علم ایک آزاد ماحول میں درس و تدریس کے مواقع سے استفادہ کر سکے - برصغیر میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے دور کا آغاز مختلف مسالک کی دینی درسگاہوں اور تدریسی اداروں کے جداگانہ قیام سے ہوا - یہ انتہائی افسوسناک بات تھی - اس دور میں مختلف مکاتبِ فکر کے جدا جدا مدارس معرضِ وجود میں آ گئے - ان درس گاہوں سے تعلیم و تربیت پانے والے طالب علم ایک مخصوص ماحول میں تحصیلِ علم کے بعد جب باہر نکلے اور مسندِ علم و ارشاد پر فائز ہوئے تو ان کے دل و دماغ مسلک کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے اور ان کے اعمال و کردار پر اس وابستگی کی گہری چھاپ نمایاں تھی - علماء کی یہ کھیپ مساجد کے محراب و منبر سے دین کے بنیادی مسائل سے صرفِ نظر کر کے اپنے اپنے مسلک اور عقائد کا پرچار کرنے لگی - فروعی اُمور میں الجھ کر علماء ایک دوسرے کو معاندانہ تنقید اور تنقیص کا نشانہ بنانے لگے - اس طرح مسلکی رواداری کے برعکس انتہا پسندی جڑ پکڑ گئی اور فرقہ پرستی اور تفرقہ پروری کی آگ بھڑک اٹھی جس سے انتشار و افتراق، فتنہ و فساد اور تشتت و نااتفاقی نے جنم لیا اور وحدتِ ملّی کے تصوّر کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا - نتیجۃً اُمت گروہوں اور دھڑوں میں بٹ گئی - اس سے اسلام

٦

کی اجتماعی حیثیت ضعف وانحطاط کی زد میں آگئی - اس صورتِ حال سے دردِ دل رکھنے والا ہر مسلمان ملول و دل گرفتہ ہے ۔ مسلکی رواداری اور وسیع المشربی کو پھر سے بحال کرنے کے لئے وسیع بنیادوں پر ایسے دینی تدریسی اداروں اور مدارس قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے جہاں پر ہر مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے طلبا، آزادانہ ماحول میں تعلیم حاصل کریں ، اور اس طرح باہمی اختلاط سے خوش گوار اور صحت مند دینی فضا قائم ہو سکے - ایسے اداروں کے فارغ التحصیل علماء جب عملی زندگی میں داخل ہوں گے تو ان کے درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے کا اسلوب مناظرانہ نہیں بلکہ مثبت ، پر وقار ، علمی ، تحقیقی ، استخراجی اور مشفقانہ انداز کا ہوگا -

---

(۵)

علماء کے لیے جدید عصری تعلیم کا انتظام

برطانوی استعمار نے برصغیر میں وارد ہو کر سب سے پہلا تخریبی کام یہ کیا کہ مسلمانوں کے اس نظام تعلیم کو تباہ کر دیا جو مدتِ مدید سے یہاں رائج تھا۔ اس نے دینی و دنیوی تعلیم کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ ایسا کرنے میں اس کے اپنے سامراجی عزائم کار فرما تھے۔ عام تعلیم کو لادینیت (SECULARISM) کے رنگ میں رنگ —— دینے سے مسلمانوں کی شاندار اقدار زوال پذیر ہو گئیں۔ آج سے ڈیڑھ دو سو سال قبل تک مسلمانوں کے دینی اور دنیوی تعلیم کے مدارس ایک ہی ہوتے تھے اور جداگانہ نظامِ تعلیم کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ ایک ہی درسگاہ سے طلباء کو سائنس، ریاضی، فلسفہ، منطق، حدیث و قرآن اور فقہی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ گویا دینی اور عصری علوم و فنون ایک ہی نصاب کا حصہ تھے۔ انگریز کے شاطر دماغ نے اپنی ریشہ دوانیوں سے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے سیکولر نظامِ تعلیم ملک بھر میں رائج کر دیا۔ ایسے نظامِ تعلیم سے عالمِ اسلام میں کوئی رومی، رازی، فارابی، جامی اور ابنِ رشد جیسا ہمہ جہت عالم، مفکر اور دانشور کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ تاریخِ اسلام کے زریں دور میں بغداد اور قاہرہ جیسی بڑی بڑی اسلامی یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں اکتسابِ علم کے لئے شرق و غرب سے کشاں کشاں لوگ چلے آتے تھے۔ پھر تاریخ کا پہیہ پلٹا اور صورتِ احوال یہ ہو گئی کہ آج اپنی زبوں حالی اور کم مائیگی کو دیکھ کر کوئی بھی درد مند مسلمان خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جُداگانہ نظامِ تعلیم کے مضر اثرات

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دورِ عروج میں مسلمان علماء، محققین اور سائنس دانوں نے علم و فن کے میدان میں حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کی ہیں۔ آج سائنسی علوم و فنون میں جس قدر ترقی اور ارتقا ہو رہا ہے اس کا سہرا مسلمان محققین اور ماہرینِ علوم کے سر ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

مسلمانوں کے دینی اداروں سے وابستہ علماء و محققین کی علمی ثقاہت کا سکہ دینی اور دنیاوی ہر دو نوعیت کے علوم پر جاری تھا۔ تعلیم و تدریس کا یہ نظام بڑی کامیابی سے دنیائے اسلام کی پوری تاریخ میں چلتا رہا۔ پھر برطانوی سامراج نے برصغیر کے مسلمانوں کے خلاف سازش کر کے سیکولر نظامِ تعلیم رائج کر دیا اور یوں مسلمانوں کی علمی برتری کی کمر توڑ دی گئی۔

دنیوی اور دینی تعلیم کی اس ثنویت (DUALITY) اور ان کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے (BIFERCATION) سے مسلم معاشرے پر انتہائی مضر اثرات مترتب ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ دینی اداروں سے فارغ التحصیل علماء مولوی تو بن گئے جن کا کام نکاح خوانی اور مُردوں کی تجہیز و تکفین کے علاوہ کچھ نہ تھا لیکن علمی دنیا پر حکمرانی کرنے والے سکالر نہ بن سکے۔ ایک زمانہ تھا کہ مولوی کا لفظ آج کے پی ایچ، ڈی ( ) اور علوم و فنون کے ماہر کے مترادف تصوّر کیا جاتا تھا۔ تاریخ میں علی قاری کے پائے کے محدّث اور عبدالرحمٰن جامی جیسے فقیہہ کا ذکر بڑے احترام سے ملتا ہے۔ جو اپنے زمانے میں ملّا کہلایا کرتے تھے۔ آج ملّا کا لفظ تحقیر و

نفرت کی علامت بن گیا ہے۔

ع ببین تفاوتِ راہ از کجا و تا بہ کجاست

آج کا مسلمان دنیاوی علوم کی شان و شوکت اور چکا چوند کے مظاہر سے مسحور ہو کر رہ گیا ہے اور دینی تعلیم کی طرف اس کا رجحان الّا ماشاء اللہ بہت کم ہو گیا ہے۔ کالجوں یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد کوئی انتظامی امور کے شعبے میں چلا جاتا ہے اور کوئی پروفیسر، ایڈووکیٹ، جج، وزیر یا سیاستدان بن جاتا ہے۔ عملی میدان میں مقابلہ و مسابقت کی بنیاد پر یہ راہیں سب کے لئے کھلی ہیں۔ دینی تعلیم کے حصول کی طرف صرف وہی لوگ آتے ہیں جنہیں جدید تعلیم کے وسائل میسر نہیں آتے یا جو ذہنی طور پر کمزور ہوتے ہیں چنانچہ ان اداروں سے نکل کر ان کے سامنے اپنی شخصیت اور انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ مسجد و مکتب میں نزاعی اور اختلافی مسائل کو شدّ و مد سے ہوا دیں اس طرح فرقہ پرستی کا پودا تناور ہو کر امّتِ مسلمہ کے لئے بہت بڑا چیلنج بن جاتا ہے۔

جدید تعلیم کی ناگزیریت

دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کا حصول وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر عہدِ حاضر کے مسائل اور بدلتے ہوئے تقاضوں سے احسن طریق سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ آج کے اس سائنسی اور مشینی دور میں انسانی معاشرے کو جو گوناگوں پیچیدہ مسائل درپیش ہیں قرآن و سُنت کی روشنی میں اس کا حقیقت پسندانہ (REALISTIC) اور وقتی ضروریات کے مطابق عملی حل (PRACTICABAL SOLUTION) تب ہی دریافت کیا جا سکتا ہے جب ہمارے علماء جدید تعلیم سے کماحقہ،

بہرہ ور ہوں - جدید تعلیم کو عام کر دینے سے وسعتِ قلب و نظر کے باعث
فرقہ پرستی کی لعنت سے کافی حد تک چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے - بصورتِ
دیگر موجودہ ماحول کو سو سال کی مسلسل کاوشوں سے بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ دینی مدرسوں کے فاضل علماء نور و بشر اور حاضر
و ناظر جیسے موضوعات پر تو گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں لیکن اگر ان سے اسلام
کے معاشی نظام، بین الاقوامی تعلقات، اقوامِ عالم کے ساتھ جنگ و صلح
کے ضابطوں، اسلامی تہذیب و ثقافت، سیاسی پالیسی، اسلامی تعزیرات
اور اسلامی معاشرت کے استحکام کے ضابطوں کے بارے میں اظہارِ خیال
کرنے کو کہا جائے تو الّا ماشاءاللہ وہ پانچ منٹ سے زیادہ کسی موضوع
پر نہیں بول سکتے - یہی سبب ہے کہ آج کی نوجوان نسل دینی علوم سے
بے بہرہ اور فرقہ پرست علماء سے حد درجہ بیزار نظر آتی ہے -

معاشرے کی اجتماعی ذمّہ داری

موجودہ حالات کا اگر ہم سنجیدگی اور
غیر جانبداری سے مطالعہ کریں تو
اس گھمبیر صورتِ حال کے ذمہ دار صرف علماء ہی نہیں بلکہ معاشرہ من حیث
الکل موردِ الزام ٹھہرتا ہے - اگر کبھی ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور
ایک لمحہ کے لئے سوچیں کہ ہم دنیاوی معاملات میں اپنی اولاد کے بہتر مستقبل
کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتے - کیا کیا منصوبے نہیں بناتے - کیا کیا خواب
نہیں دیکھتے کہ ہمارے بچے بہتر سے بہتر درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے
اونچے عہدوں اور مرتبوں پر فائز ہوں لیکن کیا کسی نے اپنے بچوں میں سے
ایک بچہ بھی میڈیکل کالج یا انجینیرنگ یونیورسٹی کی بجائے دینی تعلیم کے لئے
وقف کیا ہے - یہ سب کے لئے اور بالخصوص ان متمول لوگوں کے لئے لمحہ

فکریہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے معاشی احتیاج و ضرورت سے
بے نیاز ہیں - انہیں چاہیئے کہ وہ خدمتِ دین کے جذبے سے سرشار ہو کر
آگے آئیں اور اپنے بہتر صلاحیتوں کے مالک بچوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ
اسلامی علوم کے زیور سے آراستہ کریں - اس طرح بہتر، بالغ النظر اور پختہ
خیال افراد دین کی خدمت کے لئے مہیا ہو سکیں گے اور ایک خاموش
اسلامی انقلاب کی معاشرے میں داغ بیل ڈالی جا سکے گی -

اجتہاد کی عملی ضرورت

پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ عصری
تقاضوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے
کے لئے عوام اور حکومت کو اپنی اپنی سطح پر تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لانے
چاہئیں فی زمانہ جب سائنس و ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور پیش رفت کے
باعث طرح طرح کے معاشی، اقتصادی، سیاسی، اور بین الاقوامی مسائل
رُونما ہو رہے ہیں یہ حکومت اور عوام کی انتہائی اہم اجتماعی ذمہ داری
ہے کہ وہ مسائل کے خاطر خواہ اور مؤثر حل کے لئے جدید تقاضوں کے تحت
قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کا کام نہایت حزم و احتیاط سے ان علماء کو
سونپیں جو اس کام کی بطریقِ اولیٰ اہلیت رکھتے ہوں - اختلافی اور ما بہ
النزاع اُمور کا ایسا متفقہ حل بذریعہ اجتہاد قرآن و سنت سے استنباط
کیا جائے جو آج کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو-
لیکن اجتہاد کا یہ حق صرف قرآن و سنت سے ماخوذ شریعت پر عبور رکھنے
والے علماء ہی کو حاصل ہے جس کا استعمال جدید علوم سے مستفید ہوئے
بغیر ممکن نہیں - عملی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط اجتہاد مسلکی رواداری
اور تمام تر توجہ ان اجتماعی نوعیت کے بنیادی مسائل پر مرکوز رکھنے ہی

سے ممکن ہے جو آج ملّتِ اسلامیہ کو درپیش ہیں - اجتہاد کے فیوض و برکات سے پوری طرح متمتع ہونے کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ عصرِ جدید کے تقاضوں سے پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل پر مسلسل تحقیقی کام باہم مل جل کر کیا جائے - کاوش و تحقیق (RESEARCH) ——— جدید مسائل پر مرتکز کر دینے سے اختلافی مسائل پر توجہ کافی حد تک ختم ہو کر رہ جائے گی ، اور مثبت سوچ کی نئی راہیں کھلیں گی - اس طرح دورِ حاضر کے پریشان کن مسائل از خود حل ہوتے چلے جائیں گے -

---

٦

تہذیبِ اخلاق کے لیے مؤثر روحانی تربیّت کا نظام

تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے لئے تعلیم و تربیت کے عملی نظام کا احیآ کیا جائے اور ایسے مراکز قائم کئے جائیں جو قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ کی مثالی خانقاہوں کا معاشرے میں اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کرنے کا کام پھر سے بحال کر سکیں ۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عملی تصوف کی تعلیمات کو پھر سے اس طرح زندہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی اقدار پھر سے اجاگر ہو جائیں جن کو عملی زندگی کے ہر گوشے میں راسخ کرنے کیلئے سلسلہ در سلسلہ اولیائے کرام آتے رہے ۔ جامد خانقاہیت اور ظواہر پرستی پر مبنی تصوّف نے اسلام کی روح کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کے ازالہ کی بس یہی صورت ہے کہ عملی تصوف کے اسباق کو روحانی تربیت کے ذریعے عام کیا جائے ۔ تاکہ لوگوں کے دل نفاق و کدورت سے پاک ہو کر اخلاص و محبت کی دولت سے مالا مال ہو سکیں ۔

تاریخِ اسلام میں افرادِ انسانی کی باقاعدہ اخلاقی و روحانی تربیت اور کردار سازی کے مقدس کام کا آغاز عہدِ رسالت سے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں "اصحابِ صُفّہ" کے تربیتی ادارے کی صورت میں ہوا تھا۔ عہدِ صحابہ و تابعین کے بعد قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں یہ فریضہ صوفیائے کرام کی زیرِ نگرانی "خانقاہی نظام" نے سر انجام دیا ۔ اس نظام کے زیرِ اثر امتِ مسلمہ کو ہر دور میں جنیدؒ و بایزیدؒ جیلانیؒ و غزالیؒ، رومیؒ و جامیؒ، ہجویریؒ و اجمیریؒ، سہروردیؒ و سرہندیؒ، شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ

اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے نابغۂ روزگار میّسر آتے رہے جنہوں نے اسلام کے دورِ زوال میں بھی اُمّت کے عروقِ مُردہ میں نہ صرف نئی روح پھونکی بلکہ اسے احیاء و تجدید اور وحدت و یک جہتی کی نئی راہیں دکھائیں۔ دورِ اواخر میں مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی زوال کے نتیجے میں اس اخلاقی و رُوحانی تحریک کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا۔ اس کی رسم تو مسخ شدہ صورت میں باقی رہ گئی لیکن اس کی رُوح اور انقلابی اثرانگیزی باقی نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے بیشتر رہنماؤں میں وہ اخلاقی جرأت، رُوحانی ولولہ اور صدق و اخلاص مفقود ہوگیا جو احوالِ زمانہ کا رُخ بدلنے کے لئے ضروری ہے۔

لہٰذا آج اس اخلاقی اور رُوحانی نظام کی اصل صورت کو بحال کرنے کے لئے ایک ہمہ گیر رُوحانی تحریک کی ضرورت ہے۔ جو اُسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل اور افراد کی ظاہری و باطنی تعمیر کا بھرپور اہتمام کرے اس عملی تربیّت سے خواص و عام کے دلوں کو صدق و اخلاص، تقویٰ و پرہیزگاری، ایثار و قربانی، تواضع و انکسار اور علم و معرفت جیسے وہ لازوال جواہر نصیب ہوں گے جن سے اُن کی شخصیتیں اُسوۂ صحابہ کے رُخ پر ڈھل سکیں گی اور وہ سیرت و کردار کی رُوحانی قوّت اور اخلاقی عظمت کے باعث اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے صحیح معنوں میں ممد و معاون ثابت ہوسکیں گے۔ اگر اہلِ علم کی شخصیتوں کو یہی رنگ نصیب ہوجائے تو ان کی تبلیغ یقیناً اُمت کو وحدت اور یکجہتی کی دولت عطا کرے گی۔

۷

فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کے خاتمے کے لیے چند قانونی اقدامات

فرقہ پرستی کے محرکات، عوامل اور اسباب کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے اس کے سدِّباب کے لئے اہلِ اسلام کے سامنے ایک ایسا مفصل لائحہ عمل تجویز کیا ہے، جس پہ کاربند ہو کر فرقہ پرستی کا اگر مکمل استیصال نہیں تو کم از کم اس کے مضر اثرات کا ازالہ کر کے انجام کار ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تصور کو عملی جامہ پہنچایا جا سکتا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کے خاتمے کے لئے درج ذیل قانونی اقدامات کئے جائیں۔

۱۔ منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی

۲۔ تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ علماء پر مشتمل سپریم کونسل کا قیام

۳۔ ہنگامی تنازعات کے حل کے لیے سرکاری سطح پر مستقل مصالحتی کمیشن کا قیام

۴۔ مذہبی سطح پر منفی اور تخریبی سرگرمیوں کے خلاف عبرتناک تعزیرات کا نفاذ

(۱)

منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی

فرقہ پرستی کے رجحانات پر گفتگو کے دوران اس کی دو صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی پہلی صورت کو صریح فرقہ پرستی اور دوسری کو منافقانہ فرقہ پرستی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ صریح فرقہ پرستی پر سیر حاصل گفتگو ہو

چکی ہے - اب ہم دوسری صورت کو اپنی گفتگو کا موضوع بنائیں گے - اور تفصیل کے ساتھ اس پر اظہارِ خیال کریں گے - قرآن حکیم میں رب العزت ارشاد فرماتے ہیں -

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ	اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں - ہوشیار! وہی فسادی ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں -

مندرجہ بالا آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے وحدتِ ملّی سے منہ موڑ کر فتنہ وفساد کی راہ اختیار کر رکھی ہوتی ہے اور جب انہیں اس روش سے باز آنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ مٹھی بھر لوگ بزعمِ خویش خود کو مصلح کے رُوپ میں پیش کرتے ہیں حالانکہ وہ فی الواقع معاشرے میں فساد برپا کرنے کا موجب بن رہے ہوتے ہیں - لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے اور انجام سے بے خبر اپنی دھن میں مگن رہتے ہیں -

صریح فرقہ پرستی کا شکار ایسے لوگ ہوئے جن کی تعلیم و تربیت مخصوص مسلکی ماحول میں ہوئی اور دینی مدارس میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد جب وہ عملی زندگی کے میدان میں داخل ہوئے تو انہوں نے مسلک پرستی اور اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی تبلیغ کو ہی اپنا مطمعِ نظر بنا لیا - اس طرح فرقہ پرستی کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں - اب الا ماشاء اللہ ہمارے علماء و مبلغین نے اس کی آبیاری کو ہی اپنا دینی فریضہ سمجھ لیا ہے - اس قبیل کی فرقہ پرستی پر سابقہ صفحات میں ہم تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں -

منافقانہ فرقہ پرستی کا خاتمہ

منافقانہ فرقہ پرستی کی ماہیت کیا ہے اور اس کے اسباب و محرکات کیا ہیں؟

اس کی وضاحت کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تعلیم کی روشنی جوں جوں پھیل رہی ہے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو رہی ہے کہ فرقہ پرستی کا ماحول کسی طرح بھی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں بلکہ یہ تصوّر جدید ماحول کے پروردہ اور روشن دماغ لوگوں میں مذہب سے نفرت اور بے زاری کا باعث بن رہا ہے -

مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ اور سرمایۂ ملّی تفرقہ و انتشار کی زد میں آکر جس طرح زوال و انحطاط کا شکار ہو چکے ہیں اس پر ہر دردمند مسلمان ملول اور دل گرفتہ ہے -

فرقہ پرستانہ تقریروں کا میدان

جدید تعلیم سے بے بہرہ، نیم خواندہ لوگوں کے لئے فرقہ پرستانہ تقریریں آج بھی وقتی انبساط اور لطف اندوزی کا سامان فراہم کر رہی ہیں - لیکن جب ان تقریروں کا طلسم ٹوٹتا ہے اور لوگ ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں تو ڈیڑھ دو گھنٹہ کی تقریر محض سعیِ لاحاصل اور تضیعِ اوقات دکھائی دینے لگتی ہے - ان تقریروں سے اسلام کی کون سی خدمت بجا لائی گئی اور ملتِ اسلامیہ کی ترقی اور ارتقاء کی کون سی راہیں کھلیں؟ - یہ سوالات ذرا سے غور و فکر کے نتیجے میں انسانی ذہن میں انگڑائیاں لینے لگتے ہیں

کیونکہ نوجوان نسل بطورِ خاص فرقہ پرستی کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے ۔ لیکن وہ لوگ جن کے قلب و ذہن فرقہ پرستانہ میلانات کی غلاظتوں سے آلودہ ہیں اور جن کو ذاتی یا گروہی مفادات دینِ اسلام سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں وہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد بھی ایک ایسی ڈگر کو اپنا لیتے ہیں جو پہلے سے کہیں زیادہ بدتر فرقہ پرستی پر منتج ہوتی ہے ۔ ایسے نام نہاد علماء اور سکالر قدیم طرز کی مولویت سے ظاہراً نہ صرف بیزار دکھائی دیتے ہیں بلکہ وہ ان سب کو بلا تخصیص گردن زدنی قرار دے کر روشن خیالی اور آزاد روی (LIBERALISM) یا مذہبی رواداری کے نام پر اسلام کی ایسی زہر آلود تشریح و تعبیر کرنے لگتے ہیں جس سے فرقہ پرستی سے بیزار مسلم نوجوانوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسایا جا سکے ۔ یہ نام نہاد اتحادِ اُمت کے علمبردار فرقہ پرستی کی اعلانیہ مذمت کرنے اور خود کو اس سے ماوراء قرار دینے کے بعد نوجوان نسل کے ذہنوں میں ایسا زہر انڈیلتے ہیں جس کے اثرات فرقہ پرستی سے کہیں زیادہ ضرر رساں ہوتے ہیں ۔

یہ نام نہاد مبلغین دوسرے مسالک و مکاتبِ فکر کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح کے نام پر ایسی تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں جس سے فرقہ پرستی ایک ایسے روپ میں ظاہر ہونے لگی ہے جس کی بنیاد سب مسالک و مکاتبِ فکر اور عقائد و نظریات کی نفی ہوتی ہے اور نتیجتاً ایک نیا مکتبِ فکر وجود میں آجاتا ہے ۔

اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی

متذکرہ بالا آیۂ کریمہ میں ایسے افراد (منافقین) کی نشاندھی کی گئی ہے جنہوں نے اسلام ہی کا نام لے کر

تفرقہ اور فساد انگیزی کو اپنا شعارِ حیات بنا لیا ہے ۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس شر انگیزی سے باز آجائیں تو وہ مصلحین کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ کا ہمدرد اور بہی خواہ ظاہر کرنے لگتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے عمل سے بدترین قسم کے شر اور فساد انگیزی کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں ۔

قرآن اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ کہہ کر خبردار کرتا ہے کہ ان کی ریشہ دوانیوں اور حیلہ سازیوں سے ہوشیار رہو اور ان کے دامِ تزویر میں نہ آؤ کہ وہ اصلاح کے نام پر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں ۔

نام نہاد مصلحین کے نئے تزویراتی حربے

اسلامی تعلیمات سے والہانہ وابستگی رکھنے والا نوجوان مسلمان اپنے گرد و پیش فرقہ پرستی کی دیواریں کھڑی دیکھتا ہے تو وہ اسلام سے ہی بیزار ہونے لگتا ہے ۔ اسے بریلویت ۔ دیوبندیت ۔ اہل حدیثیت، شیعیت ایسے تمام عنوانات سے وحشت ہونے لگتی ہے ۔ فرقہ پرستی کی بھول بھلیوں میں حیران و پریشان نوجوان بالآخر ان نام نہاد مصلحین کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو ہر مسلک اور مکتبِ فکر کے خلاف زہر اُگلتے ہیں اور فرقہ پرستی یا منافرت کی تردید کے نام پر اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہی بیگانہ بنا ڈالتے ہیں ۔ وہ اپنے زعم میں اسلام کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں ۔ اور انتہا پسندی (   ) کے جوش میں اپنے سوا ہر ایک کو اسلام دشمن، کافر، ملحد، لادین اور مشرک قرار دیتے ہیں لیکن

خود عملاً فتنہ انگیزی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں ۔ نوجوان نسل کے کچے
ذہنوں میں انتشار کا بیج بو کر گمراہی کا پرچار کرتے ہیں ۔ یہ عقلیت
پرست زعماء ________ کالجوں ۔ یونیورسٹیوں دفتروں
اور جدید تعلیمی اداروں کی آغوش میں پلنے والے نوجوانوں کو بالخصوص
اپنا شکار بنا لیتے ہیں ۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے ناآشنا نوجوان مسلمان
ان کے تزویراتی حربوں کے سامنے بڑی آسانی سے سپر ڈال دیتا ہے ۔
ان کا اسلوب اور طریقِ کار وہی ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتے ہوئے
فرماتا ہے ۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا — اور جب انہیں کہا جائے کہ تم
كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ — ایمان لاؤ جیسے (اور) لوگ
قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَآ — ایمان لائے تو کہتے ہیں کیا ہم
اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ ؎ — ایمان لائیں جس طرح بے وقوف
ایمان لائے ؟

عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں منافقین انہیں تزویراتی
حربوں سے کام لے کر مسلمانوں کو بہکانے اور راہِ راست سے گمراہ کرنے
کے درپے رہتے تھے ۔ آج کے نام نہاد مصلحین کا یہ گروہ بھی اسی روش
پر چل کر مسلمانوں کی گمراہی کے لئے وہی دامِ فریب پھیلا رہا ہے جو عہد
نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں منافقین مدینہ کا شعار تھا ۔ یہ اپنے
آپ کو اصلاح کنندہ کہتے ہیں درحقیقت ان کو اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات
عزیز ہوتے ہیں ۔ یہ مذہبی لبادہ اوڑھ کر مذہب کے نام پر بڑی بڑی اجارہ داریاں

؎ البقرہ ۲ : ۱۳

قائم کر لیتے ہیں اور اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو جاہل ، بے وقوف
اور بے عقل کہتے ہیں اور فرقہ پرستی کی مذمت کرتے نہیں تھکتے لیکن
درحقیقت وہ خود فسادی اور فرقہ پرست ہوتے ہیں ۔ وہ اپنے انتہاء
پسندانہ فکر و عمل سے ایسے نئے فرقوں کی بنیاد رکھ دیتے ہیں جن سے
اُمتِ مسلمہ کی وحدت شدید قسم کے انتشار اور بے یقینی کا شکار ہو کر رہ
جاتی ہے ۔ اور وہ بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ

ع قومے بمیرد از بے یقینی

کا مصداق بن جاتی ہے ۔ یہ لوگ گو اقلیت میں ہیں لیکن اپنے وسائل
کے بل بوتے پر وہ اکثریت پر حاوی ہونے کی سعی کرتے ہیں ۔ وہ مسلمان
معاشرے میں ذہنی آمریت کا تصور اجاگر کرتے ہیں ۔ قرآن نے اسی ذہنی
آمریت کو منافقت سے تعبیر کیا ہے ۔

اُمت کا سوادِ اعظم گمراہ نہیں ہوتا

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری اُمت کی
اکثریت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی ۔ یہ اُمتِ مصطفوی صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے خصائص میں سے ہے ۔ اس کے عقائد، اخلاق اور اعمال
میں جزوی بگاڑ واقع ہو سکتا ہے ۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس
کی اکثریت برائی اور گمراہی پر متفق اور مجتمع ہو جائے ۔ وہ بے دینی
پر مجتمع ہو ہی نہیں سکتی ۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد
فرمایا :۔

(۱) علیکم بالجماعة [1] — تم جماعت کو لازم پکڑو۔

(۲) ویداللہ علی الجماعة [2] — جماعت پر اللہ (کی حفاظت) کا ہاتھ ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

ان اللہ لا یجمع امتی علی ضلالة [3] — بے شک اللہ تعالیٰ میری اُمّت کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اُمت کا اجماع ضلالت و گمراہی پر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس اجماع کا مطلب پوری اُمت کا کسی کام پر سو فیصد متفق ہونا نہیں۔ کیونکہ یہ تو قطعی طور پر ویسے بھی ناممکن ہے۔ کہ پوری اُمّت بلا اختلاف کسی غلط بات پر متفق ہوجائے۔ اختلاف رائے کا ہونا منطقی اور قدرتی عمل ہے۔ متذکرہ بالا احادیثِ مبارکہ کا مقصد درحقیقت اس تصوّر کو ذہنوں میں جاگزین کرنا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کی بھاری اکثریت شر و فساد اور ضلالت و گمراہی پر کبھی مجتمع نہیں ہوسکتی۔ یہی اس اُمت کی خصوصیت ہے۔ اس تصوّر کی وضاحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثِ صحیح سے ہوجاتی ہے۔

---

[1] ترمذی ۲ : ۳۹ [2] ترمذی ۲ : ۳۹

[3] سنن ترمذی، ۲ : ۳۹۔ اس قسم کی ایک روایت سنن ابن ماجہ میں بھی ہے۔ ان امتی لا تجتمع علی ضلالة فاذا رایتم اختلافا فعلیکم بالسواد الاعظم (ابن ماجہ ۲۹۲ ابواب الفتن، باب السواد الاعظم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اثنان خیر من واحد وثلاث خیر من اثنین واربعة خیر من ثلاثه فعلیکم بالجماعة فان اللہ عز وجل لن یجمع اُمتی الا علی ھدًی [1] — کسی مسئلے پر دو افراد کا ایک کے مقابلے میں جمع ہونا محفوظ تر ہے اور اسی طرح چار تین کے مقابلے میں بہتر ہیں پس تم پر اکثریتی جماعت کی پیروی لازم ہے کیونکہ اللہ رب العزت میری اُمت کو سوائے ہدایت کے کسی غلط بات پر جمع نہیں ہونے دے گا۔

فرمودۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم "علیکم بالجماعة" اس بدیہی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اُمت کی جمعیت بہر حال بہتر ہوتی ہے اور اکثریت اقلیت کے مقابلے میں زیادہ محفوظ و مامون ہوتی ہے۔ حضرت ابوجعفرؓ سے حضرت عمرؓ کا ارشاد مروی ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی وضاحت ہوتی ہے۔

قال عمر بن الخطابؓ لاصحاب الشوریٰ تشاوروا فی امرکم فان کان اثنان واثنان فارجعوا فی الشوریٰ — حضرت عمر بن الخطابؓ نے اصحابِ شوریٰ سے ارشاد فرمایا کہ اپنے امور میں باہمی مشورہ کیا کرو۔ اگر کسی مسئلہ پر تمہاری رائے، دو اور دو میں مساوی

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ۵ : ۱۴۵

وان كان اربعة واثنان فخذوا صنف الاكثر [۱]

تقسیم ہو جائے تو پھر اسے شوری میں لے جاؤ۔ اگر رائے کی تقسیم چار اور دو میں ہو جائے تو اکثریتی رائے کو اپنا لو۔

اسلام کی روحِ شورائیت

اس حدیث مبارکہ کی رو سے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلے پر اختلاف ہو جائے اور لوگ دو گروہوں میں برابر برابر تقسیم ہو جائیں تو پھر آپس میں باہم مشاورت کر لی جائے۔ اسلام میں شورائیت کی یہ روح ہی اصلِ جمہوریت ہے جس کو اکثر لوگ غلط فہمی سے مغرب کی طرف سے آیا ہوا تصور خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ مغرب کے اقتدار و غلبہ کی تاریخ دو تین سو سال سے زیادہ پرانی نہیں اور اسلام کے وضع کردہ جمہوریت کو چودہ صدیوں سے زائد عرصہ بیت چکا ہے۔ اسلامی اقتدار کی چودہ سو سالہ تاریخ جس میں خلافتِ راشدہ اور اسکے بعد آنے والے ادوار شامل ہیں اس امر کی شاہد ہے کہ اکثریت کے جمہوری حق کا ہمیشہ احترام کیا جاتا رہا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی عمل رہا ہے جس پر خلفائے راشدین اور بعد میں آنے والے سنتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبع حکمران کاربند رہے ہیں۔ اسلام میں مطلق آمریت کا تصور اس کی روحِ جمہوریت و شورائیت سے متصادم ہے۔ خلفائے راشدین کا بھی یہی عمل رہا ہے کہ وہ ہر اہم فیصلہ اکثریت رائے سے طے کرتے۔ اس سلسلے

۱۔ کنز العمال، ۵: ۷۳۳، حدیث، ۱۴۲۵ (طبقات ابن سعد، ۳: ۶۱)

میں حضرت علی کا ایک ارشاد نہج البلاغہ میں مروی ہے فرماتے ہیں۔

وسيهلك فيّ صنفان: محب مفرط يذهب به الحب الى غير الحق ومبغض مفرط يذهب به البغض الى غير الحق وخير الناس فيّ حالاً النمط الاوسط فالزموه والزموا السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة واياكم والفرقة فان الشاذ من الناس للشيطان كما ان الشاذ من الغنم للذئب الا من دعا الى هذا الشعار فاقتلوه ولو كان تحت عمامتي هذه [۱]

میرے بارے میں دو گروہ ہلاکت کا شکار ہونگے پہلا وہ جس نے میرے ساتھ محبت میں غلو کیا اور حق کے راستے سے دور چلا گیا۔ دوسرا وہ جس نے میرے ساتھ بغض میں غلو کیا اور گمراہ ہوا۔ میرے ساتھ محبت میں جو اعتدال اختیار کرے گا۔ وہی سب سے بہتر ہے۔ اے لوگو تم بھی اسکے ساتھی بن جاؤ اور جماعت سے منسلک رہو کیونکہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے فرقہ بازی سے باز آؤ کیونکہ عوام کی اکثریت سے علیحدہ ہونے والا شیطان کا ساتھی ہے جس طرح ریوڑ سے علیحدہ ہونے والی بکری بھیڑیئے کی نذر ہو جاتی ہے اے لوگو! جو جماعت سے علیحدگی کا طریقہ اختیار کرے اسے قتل کر دو اگرچہ وہ میرے عمامے کے نیچے ہی

---

۱ نہج البلاغہ ۲ : ۱۲/۱۱

پناہ لینے والا کیوں نہ ہو۔

علامہ مرحوم نے اسی تصور کو یوں بیان کیا ہے۔

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر
ہست شیطاں از جماعت دور تر

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت سے وعدہ کیا ہے کہ خدا ہمیشہ میری اُمت کی اکثریت کا ساتھ دے گا اور میری امت کی اکثریت کبھی صراطِ مستقیم سے نہیں بھٹکے گی۔

قرآنِ حکیم ان مٹھی بھر لوگوں کی اقلیت کو جو مسلمانوں کی اکثریت کو بے وقوف اور بے عقل گردانتی تھی۔ خود بے وقوف اور بے عقل کہہ رہا ہے۔ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ۔ وہ خود راہِ حق سے بھٹکے ہوئے اور بے عقل ہیں۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات چونکہ ابدالآباد تک ناقابلِ تغیر ہیں لہٰذا آج بھی ان کی حقانیت میں ذرہ بھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن ان لوگوں کو جو خود کو اصلاح کنندہ کے طور پر پیش کر کے صرف اپنے آپ کو حق و صواب پر قائم اور دوسرے تمام مسلمانوں کو گمراہ لادین اور عقل و دانائی سے عاری قرار دیتے ہیں۔ گم کردہ راہ اور بے عقل کہتا ہے۔

تاریخِ اسلام کے شواہد و نظائر

اسلام کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ جتنی بھی الحادی تحریکیں باطل فرقے اور متکبر قیادتیں اُبھری ہیں وہ اصلاح کا نعرہ لے کر اٹھی ہیں۔ ان کے داعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کی اکثریت کو گمراہ اور خود کو

حق و راستی کی راہ پر سمجھتے آئے ہیں۔ اس کی ابتدا خلافتِ راشدہ کے دورِ آخر سے ہی ہو گئی تھی۔ جب خوارج کا ایک اقلیتی ٹولہ وجود میں آیا جنہوں نے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا نعرہ بلند کیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حقِ حکمرانی کسی کو حاصل نہیں، انہوں نے حکومتِ الٰہیہ کی آڑ میں اپنے سوا باقی سب کو مشرک و کافر قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضرت علی رضؓ اور حضرت معاویہؓ کو بھی کافر و مشرک کہا اس تکفیر کی زد میں سب صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین آ گئے۔ خارجیوں نے ان اکابر صحابہ کے خلاف بلا تخصیص و امتیاز جنگ کا اعلان کر دیا۔ بالآخر حضرت علی رضؓ کی شہادت بھی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہوئی۔

بعض مبلغین کے ظاہر و باطن کا تضاد اور ارشادِ نبوی

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے لوگوں کے بارے میں پیش گوئی فرما دی تھی کہ وہ نماز۔ روزہ اور دوسری فرضی اور نفلی عبادات کے پابند ہوں گے۔ بزعمِ خویش قرآن کے بہت بڑے علمبردار ہوں گے اور وہ قرآن کی حکمرانی کے داعی بھی ہوں گے اور تلوار لے کر جہاد کے لئے ہمہ وقت مستعد اور تیار بھی نظر آئیں گے۔ لیکن ان کا نقطۂ نظر یہ ہو گا کہ وہ اپنے سوا باقی سب کو گمراہ کافر و مشرک اور واجب القتل سمجھیں گے۔ دیکھنے والا ان کے نماز، روزہ اور نفلی عبادات میں استغراق اور خشوع و خضوع سے دھوکا کھا جائے گا۔ لیکن آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق وہ دین و ایمان سے اس طرح خارج ہو چکے ہوں گے جیسے شکاری کا تیر شکار کے اندر سے گزر جاتا ہے اور اس کی نوک پر ایک قطرۂ خون بھی

قائم نہیں رہتا۔ ان کا ظاہر سرتا پا اسلام لیکن باطن اسلام اور ایمان کے نور
سے خالی ہوگا۔ انکی زبانوں سے شیریں مقالی اور شکر بیانی ٹپکے گی لیکن
ان کے دل بھیڑیئے کی درشتی سے سوا ہوں گے۔ ظاہراً وہ اُمت کی
اصلاح کا دم بھریں گے۔ لیکن اپنے عمل سے وہ اپنے اس دعوٰے کی
نفی کریں گے۔ اور اُمت میں بدترین انتشار اور نفاق کا بیج بوئیں گے۔
وہ اسلام سے وفاداری کا دم بھر کر اسلام دشمنی کی راہ اختیار کریں گے۔
یہ منافقانہ فرقہ پرستی جس کی نشاندھی مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم نے فرمادی تھی ہر دور میں موجود رہی ہے۔ آج بھی ایسے لوگ
سرگرمِ عمل ہیں جو بظاہر اسلام کے سب سے بڑے شیدائی اور فرقہ پرستی سے
متنفر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد
اسلامی تعلیمات کے بہت بڑے مبلغ بن گئے اور اپنی دانست میں اپنے
سوا باقی سب کو جاہل، مشرک اور واجب القتل سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا
طریقہ یہ ہے کہ وہ فرقہ پرستی کی مذمت اور اتحادِ ملت کے نام پر نوجوانوں
کو اس انداز سے تعلیم دیتے ہیں کہ وہ اپنے سوا باقی سب مسلمانوں کو گردن
زدنی سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک اہم نکتہ اُمّتِ مسلمہ کے لئے صریح فرقہ پرستی اتنی نقصان دہ اور ضرر رساں ثابت نہیں ہوئی جتنی کہ موجودہ منافقانہ
فرقہ پرستی ثابت ہو رہی ہے۔ اس فرقہ پرستی کے پیرو اور نام نہاد
مبلغین بڑے شدّومد سے دعوٰے کرتے ہیں کہ حق وہی ہے جو وہ کہتے
ہیں اور ان کے سوا باقی سب دنیا جہالت اور گمراہی کے اندھیروں
میں بھٹک رہی ہے۔ سوچیئے اور غور کیجیئے کہ اگر ذہنی تعصب اس حد

تک پہنچ جائے تو اس فضا میں جنم لینے والی فرقہ پرستی کتنی خطرناک
مضمرات کی حامل ہوگی۔ ان فرقہ پرستوں کا طریق کار یہ ہے کہ وہ تعلیم
یافتہ نوجوانوں کو اپنا ہدف بناتے ہیں اور ان کو اپنے گرد کھینچ کر فرقہ پرستی
کی مذمت اور اتحادِ ملّت کی ضرورت پر اپنا زورِ بیان صرف کرتے ہیں۔
لیکن وحدت کے نام پر وہ قوم کے اندر ایسا انتشار پیدا کر دیتے ہیں کہ
ملّت گروہ در گروہ تقسیم ہو کر اپنی قوت اور توانائی سے محروم ہونے
لگتی ہے۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی
کے میلانات کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جائے تاکہ نئی نسل اس غیر
محسوس زہر سے اپنے دل و دماغ کو تحفظ فراہم کر سکے۔ یہ کام تبھی ممکن ہے
کہ یہ تصوّر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ فرقہ پرستی کسی خاص مسلک،
مکتبِ فکر یا کسی مخصوص عنوان کو نہیں کہتے بلکہ اس سوچ اور زاویۂ نگاہ کو
کہتے ہیں جو ہر دوسرے کو غیر مسلم، لادین اور کافر و مشرک بنانے سے
عبارت ہو اور جس کے نتیجے میں صرف خود کو حق پر قائم تصور کیا جائے
اور باقی تمام مسلمانوں کو گمراہ۔

(۲)

تمام مکاتبِ فکر کے نمائندہ علماء پر مشتمل سپریم کونسل کا قیام

ہر نوعیت کی فرقہ پرستی کی قانونی حوصلہ شکنی کے ساتھ ساتھ مختلف مکاتبِ فکر کے
نمائندہ مسلّمہ علماء پر مشتمل ایک کونسل قائم ہونی چاہیئے۔ جس میں مشترک طور پر ایک ضابطۂ اخلاق

طے کیا جائے۔ تاکہ ہر مسلک کے واعظین، مقررین، مبلغین اور علماء و مصنفین اس ضابطۂ اخلاق کے دائرہ میں رہ کر دعوت و تبلیغ دین اور اشاعت مسلک کا کام کریں۔ اس ضابطۂ اخلاق کے ذریعے اس امر کی ضمانت مہیا کی جائے کہ کوئی شخص کسی مسلک کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ کیچڑ نہ اچھال سکے۔ یہ کونسل ایسے اکابر اور ذی اثر علماء پر مشتمل ہو کہ ان کے متعلقہ مسالک کے علماء و مبلغین ان کی ہدایات پر سختی سے عملدرآمد کے پابند ہوں۔ ان علمائے کے ذریعے اس امر کی یقین دہانی حاصل کیجائے کہ اس اخلاقی ضابطے کی خلاف ورزی کرنے والا کوئی بھی خطیب، مقرر، مصنف اور مبلغ نہ صرف اپنے اکابر کے سامنے جوابدہ ہوگا بلکہ اس کے خلاف مسلکی اور تنظیمی سطح پر تادیبی کارروائی بھی کی جائے گی۔ مثلاً اس مسلک سے متعلق کسی بھی مذہبی یا سیاستی تنظیم میں اسے کسی عہدہ پر برقرار نہ رکھا جائے گا اسکی رکنیت کو معطل کردیا جائے گا مذہبی اور تنظیمی اجتماعات میں اسے نمایندے کے طور پر شمولیت سے باز رکھا جائے گا اور شہری و تنظیمی سطح پر اسے اسکی مسجد کی خطابت یا متعلقہ ادارے کی نظامت و سربراہی سے علیحدہ کرنے کے لیے اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا۔

ان اقدامات کے پیچھے جب تک اس نوعیت کی مؤثر اور فیصلہ کن اخلاقی ضمانتیں موجود نہیں ہوں گی، یہ محض نیک تمناؤں اور آرزوؤں کا پلندا ہوگا۔ ایسی سفارشات سے اتحادِ امّت کی منزل کی طرف ٹھوس پیش رفت نہ ہو سکے گی۔

اِس وقت عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ ہر طبقہ و مسلک کے ذمّہ دار افرادِ اُمّت کو انتشار و افتراق کی آگ سے نجات دلانے اور وحدت و یکجہتی کی فضا کو فروغ دینے کے لیے اتحاد و اخوت کی بات تو کرتے ہیں۔ ایسے منصوبوں میں شامل بھی ہوتے ہیں، اخباری بیانات کے ذریعے فرقہ وارانہ رجحانات کی مذمت بھی کرتے ہیں لیکن انھیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی جماعت، تنظیم اور مسلک سے تعلق رکھنے والے کون کون سے افراد بالواسطہ یا بلاواسطہ فرقہ وارانہ تضادات و فسادات کو ہوا دینے میں ملوث

ہیں۔ ان کے زیرِ اثر کتنے حلقے اپنے مزعومہ مفادات کی خاطر فرقہ وارانہ کارروائیوں اور سازشوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ سرپرستی فرما رہے ہیں اور کس حد تک ان کے دامن اس گھناؤنے جرم کی سیاہی سے داغدار ہیں۔ مگر وہ نہ تو انھیں اس عمل سے روکتے ہیں اور نہ ان کے خلاف جماعتی سطح پر کوئی کارروائی عمل میں لاتے ہیں۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان طبقات نے اپنی "وارداتوں" کیلئے جُدا جُدا محاذ کھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک کے ذمے "قتل" ہے۔ دوسرے کے ذمے اخبارات میں بیانات مذمت اور تیسرے کے ذمے "مصالحت"۔ ہر ایک کو اس کے منصب اور حیثیت کے مطابق کام سونپا گیا ہوتا ہے۔ مقصد (الاّ ماشاءاللہ) سب کا ایک ہے مگر طریقے جُدا جُدا، ایک چہرے پر کئی چہرے سجانے والے جب تک خود اپنے اندر صدق و اخلاص پیدا کر کے اس دجل و فریب اور منافقانہ روش سے باز نہیں آتے اس وقت تک اس لعنت سے نجات بہت مُشکل ہے۔

(۳)

ہنگامی نزاعات کے حل کے لیے سرکاری سطح پر مستقل مصالحتی کمیشن کا قیام

بعض اوقات مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے دو حلقوں میں کسی مسئلے پر ایک ہنگامی نزاع واقع ہو جاتا ہے۔ جو مقامی سطح پر باہمی افہام و تفہیم سے حل نہیں ہو سکتا اور یہ نزاع بڑھ کر وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے واقعات کے بار بار رونما ہونے سے وحدت و یکجہتی کے مقصد کو خاصا ضعف پہنچتا ہے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جب ایسی صورتِ حال سے امنِ عامہ کو خطرہ لاحق

ہونے لگے تو حکومت مداخلت کر کے مصالحتی کمیشن یا تحقیقاتی ٹریبونل وغیرہ قائم کرتی ہے۔ لیکن نزاع کو نقصان کے واقع ہو جانے کے بعد رفع کرنے سے زیادہ بہتر ہے کہ نقصان کے وقوع سے پہلے اس کا تدارک کر دیا جائے۔

اگر ایسے نزاعات کو نبٹانے کی ذمہ داری کسی ایک غیر جانبدار تحقیقاتی اور مصالحتی کمیشن یا ٹریبونل کے سپرد کر دی گئی ہو، جو اختلاف و نزاع کے پیدا ہوتے ہی معاملے کی مکمل تحقیق کر کے فیصلہ دے اور فی الواقع متاثر ہونے والے فریق کی دادرسی کرے تو ہنگامی کشیدگیوں کے مزید فروغ پانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اگر کسی طبقے کو اپنے مسلکی و مذہبی حقوق کے پامال ہونے کا شکوہ حکومت کے خلاف ہو تو اس کا فیصلہ بھی آزادانہ طور پر اسی عدالت کے ذریعے ہو سکے۔ مذہبی حقوق کی ایسی آزادانہ دادرسی کا سرکاری سطح پر اہتمام ہو تو مطلوبہ نتائج کا حصول نہ صرف بہت آسان ہو جائے بلکہ بعض بے بنیاد غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو سکے گا جن کے سبب سے مستقل طور پر باہمی عناد و مخاصمت کی فضا قائم رہتی ہے۔

(۴)

مذہبی سطح پر منفی اور تخریبی سرگرمیوں کے خلاف عبرتناک تعزیرات کا نفاذ

فرقہ وارانہ تخریبی سرگرمیوں کے ذریعے، اُمّتِ مسلمہ کے شیرازۂ اتحاد کو پارہ پارہ کرنا، بلا شک و شبہ "فساد فی الارض" ہے۔ اور شریعتِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کسی قیمت پر "فساد فی الارض" کے جرم پر معافی کی روادار نہیں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ [1]

جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے اور زمین میں فساد انگیزی کرتے ہیں انکے جرم کی سزا یہی ہے کہ چن چن کر قتل کر دیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا انکے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹے جائیں یا زمین میں انکی نقل و حرکت بند کر دی جائے یعنی قید کر دیے جائیں۔

ہر چند کہ اس آیت کریمہ کا اطلاق عام طور پر ڈاکے پر کیا گیا ہے لیکن خود قرآن و سُنّت سے ثابت ہے کہ "فساد فی الارض"، کا حکم کئی اور جرائم پر بھی صادر ہوتا ہے۔

سورۃ بقرہ میں منافقین کی فتنہ پردازیوں کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ [2]

اور جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد انگیزی نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

قرآن و حدیث میں جس شدومد کے ساتھ اسلام میں تفرقہ پردری اور فتنہ پردازی کی مذمّت کی گئی ہے اسے فساد فی الارض تصور نہ کرنے کا کوئی شرعی جواز نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا اخلاقی جماعتی اور سرکاری سطح پہ باوجود تمام تنبیہی، تذکیری اور تادیبی کوششوں کے، اگر کوئی شخص اپنی نام نہاد گروہی قیادت چمکانے اور مذموم مفادات کو حاصل کرنے کے لیے اُمّت میں فرقہ وارانہ تخریبی کارروائی کا مرتکب ہوتا ہے تو

---

[1] (المائدہ (۵) : ۳۳) [2] (البقرہ (۲) : ۱۱)

اسلامی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ ایسے شخص کو "فساد فی الارض" کے سنگین جرم کے تحت تعزیری سزا دے - جرم کی سنگینی کے پیش نظر قرآن مجید نے چار متبادل سزائیں بیان فرما دی ہیں اور احادیث کے ذریعے بھی بعض دیگر تعزیرات کی نشاندہی ہوتی ہے -

چنانچہ اس مقصد کے لیے حسب ضرورت سخت سے سخت تر سزا دے کر ایسی تخریبی کارروائیوں کا مکمل استیصال کیا جانا چاہیئے - مستزاد یہ کہ فرقہ وارانہ تخریبی کارروائیاں صریحاً "فتنہ" کے ذیل میں بھی آتی ہیں - جسے قرآن قتل سے شدید تر جرم قرار دیتا ہے - الغرض ایسی کئی شرعی دفعات ہیں جن کے تحت تعزیراتی نظام نافذ کر کے اس لعنت کو ختم کیا جا سکتا ہے -

بے شک ایسی تخریبی کارروائیاں، مذہب کے نام پر کی جاتی ہیں مگر واضح ہو کہ ان کے خلاف ایسے تعزیراتی اقدامات سے مذہب کا تقدس قطعاً پامال نہیں ہوگا - کیونکہ جب کسی نام نہاد "مذہبی کارروائی" سے اسلام اور امت مسلمہ کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو اسلام اسے سرے سے "مذہبی عمل" ہی تصور نہیں کرتا بلکہ دین و مذہب کے خلاف ایک منافقانہ سازش سے تعبیر کرتا ہے - قرآن شاہد ہے کہ منافقین مدینہ نے "مسجد" کے نام پر ایک مذہبی مرکز اور عبادت گاہ تعمیر کی تھی - چونکہ اس کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور اسلام کے استحکام کو نقصان پہنچانا تھا اس لیے نبی کریم کو نہ صرف اس میں نماز ادا کرنے سے منع فرمایا گیا بلکہ اسے مسمار کر کے جلا دینے کا حکم صادر ہوا اور نتیجۃً ایسے ہی کیا گیا ارشاد باری ملاحظہ ہو:-

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ط وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ط وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ط"[1]

اور جنہوں نے مسجد بنائی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کفر کو فروغ دینے اور اہل ایمان میں تفرقہ ڈالنے کے لیے اور ایسے لوگوں کی تاک میں جو پہلے سے ہی اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہوں - وہ یقیناً قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہم نے تو محض نیکی کا ارادہ کیا ہے - مگر اللہ گواہ ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں - اے محبوب! تم اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہونا -

جس طرح اس مسجد کا مسمار کیا جانا، کسی اسلامی شعار کی بے حرمتی کا سبب نہیں بنا اسی طرح تفرقہ پرست اور تخریب کار افراد کے خلاف تعزیری کارروائی قطعاً علماء اسلام کے تقدس کے خلاف تصور نہیں ہو سکتی - اسلام کی حرمت، دین کا استحکام اور امت کی وحدت دیکھیں ہر شخص کی ذاتی عزت سے زیادہ عزیز ہے علماء اسی وقت تک دین کی عزت و حرمت کا سبب اور علامت رہتے ہیں - جب تک وہ دین کی عزت و حرمت کے لیے مصروف کار رہیں - اگر وہ خود اپنے قول و عمل کے تضاد، منافقانہ روش اور مناقشانہ مساعی کے باعث امت مسلمہ کو نقصان پہنچانے لگیں تو وہ ہرگز حرمت دین کی علامت تصور نہیں ہو سکتے - پھر ان کی حیثیت مجرمانہ ہو جاتی ہے اور ایسے اشخاص کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث سے واضح رہنمائی ملتی ہے -

عن انس رضی اللہ تعالی عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال رأیت لیلۃ اسری بی رجالا تقرض شفاھھم بمقاریض

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے شب معراج کچھ لوگوں کو دیکھا جن کی زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جا رہی

[1] توبہ ۹ : ۱۰۷

مِن نارٍ قلت من هٰؤلاء یا جبرئیل
قال هٰؤلاء خطباء مِن امتک
یامرون الناس بالبرّ وینسون
انفسهم (فی روایۃ) الذین یقولون
ما یفعلون و یقرءون کتاب اللّٰه
ولا یعملون۔

(شرح السنۃ، شعب الایمان[1])

تھیں۔ میں نے جبرئیلِ امین سے پوچھا کہ
یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا
یہ آپکی اُمّت کے وہ خطباء اور واعظین
ہیں جو لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں مگر
اپنے آپ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

دوسری روایت کے مطابق یہ وہ خطباء ہیں
جو دوسروں کو بھلائی کی بات کہتے ہیں لیکن
خود عمل نہیں کرتے اور قرآن پڑھتے ہیں
لیکن اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

---

[1] بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح: ۴۳۸)
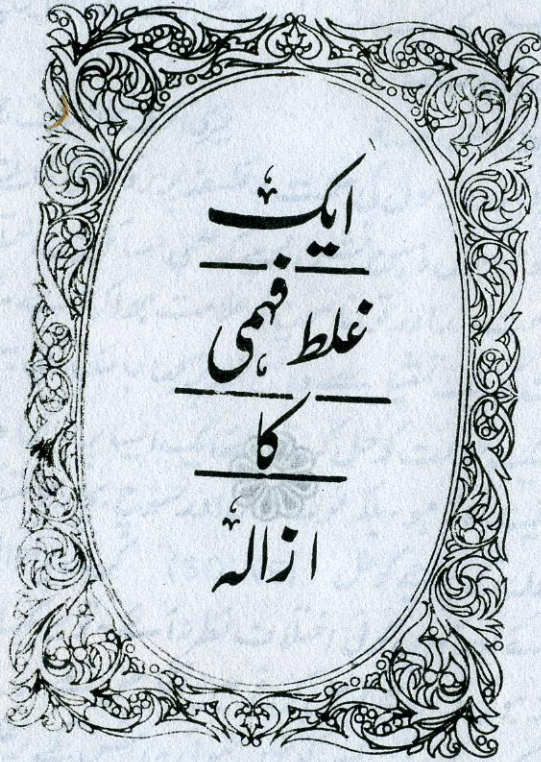
یہاں برسبیل تذکرہ ہم ایک ایسی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی نسبت بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہے۔ حضور کا فرمان ہے۔

اختلاف اُمتی رحمۃ — میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے

اس فرمودۂ رسول کی حکمت و فلسفہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے ایک بنیادی اصول ذہن نشین رہے کہ علمی مسائل میں اختلاف بیدار مغزی، صحت مند اور توانا سوچ کی علامت ہوا کرتا ہے۔ علمی اختلاف کی اہمیت کو ایک تمثیل سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ بیس تیس طلبار کی ایک جماعت کو حل کرنے کے لئے ایک ایسا پرچہ تھما دیا جائے جو حسابی نوعیت کا نہ ہو۔ بلکہ غور و خوض اور سوچ بچار کا متقاضی ہو۔ اگر تمام لڑکوں کے پرچے کو حل (SOLVE) کرنے پر سوال کا ایک سا جواب آئے اور کہیں کوئی اختلاف نظر نہ آئے۔ تو یہ یکسانیت اس امر کی غماز ہوگی کہ پرچے کو حل کرنے میں نقل چلی ہے اور اپنی عقل کو استعمال کرنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اگر مختلف جوابات سامنے آئیں تو یہ اختلاف اس امر کی نشان دہی ہوگا کہ طلباء نے محنت اور ذوق و شوق سے پڑھا ہے اور وہ اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں۔ ثابت ہوا کہ علم و فکر کا باہمی اختلاف اور تنوع بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور متحرک سوچ کو نیا رخ عطا کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذکورہ ارشاد اسی حکمت پر دلالت

کرتا ہے۔ علمی اختلاف کے دروازے بند کر دینے سے سوچ میں جمود اور تعطل واقع ہو جاتا ہے۔ جس سے معاشرے کا ارتقائی عمل رک جاتا ہے اور زندگی کی جدوجہد میں ترقی اور پیش رفت کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ آج کی دُنیا میں علوم و فنون میں محیّر العقول ترقی علمی و فکری اختلاف کی مرہونِ منت ہے۔ بلکہ ہر فن اور علم کا ارتقاء ہمیشہ تحقیق اور اجتہادی اختلاف در اختلاف ہی پر منحصر ہوتا ہے۔

اختلاف وافتراق میں فرق

اُمت کا اختلاف اس وقت تک رحمت ہے جب تک یہ علمی حلقوں اور علماء کے دائروں میں محدود رہے لیکن جب یہ اختلافِ علمی اجتہاد و ارتقاء کی بجائے سیاسی مقاصد، منفعت براری، اور حصولِ جاہ و منزلت کے لئے استعمال ہونے لگے تو پھر یہ اختلاف باعثِ رحمت و ثواب نہیں بلکہ باعثِ زحمت و عذاب بن جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اُمتِ مسلمہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ گلی کوچوں، مکتبوں اور مسجدوں کے محراب و منبر سے اختلافات کا اُبھرنا اُمتِ مصطفوی میں بدترین قسم کے انتشار اور تفرقہ کو جنم دیتا ہے۔ دین کو کاروبار اور پیٹ کے دھندے کے لئے استعمال کیا جانے لگے تو ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ بن جاتی ہیں۔ ہر شخص کوچہ و بازار میں اختلافی مسائل کو ہوا دینے لگتا ہے۔ اور فروعات میں اُلجھ کر ہمہ وقت ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو کر مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے۔ اس ماحول میں اختلافات دشمنی کا روپ دھار لیتے ہیں اور مسلمان مسلمان کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے، باہمی محبت و مودت کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور مسلمان ہو کر بھی ایک دوسرے کو کافروں سے بدتر سمجھنے لگتے ہیں۔

مثبت اسلوبِ بیان سے اختلاف، رحمت رہتا ہے مگر منفی اسلوبِ بیان اسی کو زحمت بنا دیتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت ایک سادہ سی مثال کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ آپ کے پاس ایک گلاس ہے جو ایک تہائی پانی سے بھرا ہوا ہے۔ آپ اس بات کو بیان کرنا چاہیں تو تو کہہ سکتے ہیں کہ گلاس کا ایک تہائی حصہ پانی سے بھرا ہوا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ گلاس کا دو تہائی حصہ پانی سے خالی ہے دونوں طرح بات ایک ہی ہوگی۔ پہلا انداز مثبت اور دوسرا منفی ہوگا۔ مثبت انداز میں اچھائی اور خوبی اور منفی انداز میں نقص اور کمی کا ذکر ہوگا۔

دینی تبلیغ و دعوت میں تنقیدی اور منفی انداز اختیار کرنے کی بجائے تحقیقی، علمی اور مثبت انداز اپنانا ہمیشہ سود مند اور بہتر نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ کسی کی دل آزاری نہیں ہوگی اور ہر مکتب فکر کا آدمی بڑے سکون اور دل جمعی سے آپ کی بات کو سنے گا اور اس سے استفادہ کرے گا۔

مذہبی زندگی میں موجود اختلافات و مناقشات کا ازالہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ ہر مسلک کے ذمہ دار اصحاب اختلافی مسائل کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے دوسرے مسلک کو بے جا طعن و تشنیع، عیب بینی اور نکتہ چینی کا نشانہ نہ بنائیں۔ کسی کو کافر، مشرک، بدعتی اور گستاخ جیسے القاب سے نہ نوازیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں مثبت انداز سے اپنے مسلک کو بیان کریں۔ اپنے مسلک کی تعریف و تحسین میں جو چاہیں کہیں لیکن دوسروں کی تنقیص و تذلیل سے باز رہیں۔ اگر ہم نے اس طرزِ عمل کو اپنا لیا تو علمی استدلال اور عقیدے کی پختگی کی بنا پر جدو جہد

للبقاء کی دوڑ میں صرف وہی مسلک زندہ رہے گا جو قوی اور مضبوط ہوگا اور دوسرا از خود اپنے فطری انجام سے دوچار ہوجائے گا۔ اس طرح صحیح مسابقت (COMPETITION) کی فضا پیدا ہوگی اور ماحول منافرت سے پاک ہوکر ملّی اتحاد کا پیش خیمہ بن جائے گا۔

ایک اہم غور طلب پہلو

بہ نظرِ غائر تاریخ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ سارے مسلکی اختلافات جن پر آج ایک دوسرے کو گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے برصغیر کی تاریخ میں گزشتہ ۱۰۰ سال سے زیادہ پُرانے نہیں۔ اس دور سے پہلے کے سب بزرگ (مثلاً: حضرت مجدد الف ثانی رح، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح، شیخ احمد مُلّا جیون امیٹھوی، شاہ ولی اللہ دہلوی رح، شاہ عبدالعزیز دہلوی رح، قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح وغیرہم) جن کی علمی وجاہت کے سامنے ہم سب کی نگاہیں فرطِ عقیدت سے جھک جاتی ہیں اور جو ہمارے نزدیک مسلّمہ طور پر محترم ہیں۔ ان کے اسلوبِ زندگی اور طریقِ تبلیغ سے کھلم کھلا انحراف چہ معنی دارد؟

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رح، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح ایسی نامور دینی شخصیات اختلافی دور میں بھی پیدا ہوتیں ہیں جنہوں نے ہر مکتبِ فکر کے افراد کے دلوں میں متنازعہ فیہ مسائل کی گھتیاں سلجھانے کے لئے کتابیں لکھیں۔ فارمولے وضع کئے (کم از کم مسلکِ اہل سنت کے دعویداروں میں ان کے لیے قدر و منزلت کا مقام پایا جانا ہے) انکی تصانیف آج بھی راہنمائی کے لئے موجود ہیں کوئی چاہے تو مقصدِ اتحاد کے لئے ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ دین

کے معاملہ میں پیٹ کو ترجیح نہ دی جائے۔ ذاتی اور گروہی مفاد، جاہ پسندی اور منفعت اندوزی کے مقابلے میں دین کی عزت و ناموس اور حمیت کو مقدم جانا جائے۔

مزید یہ کہ اُمت مسلمہ کے موجودہ انتشار و افتراق کو اتحاد و یکجہتی میں بدلنے کے لئے ٹھوس بنیادوں پر واضع کردہ ایک متفقہ ضابطۂ اخلاق کا نفاذ (ENFORCEMENT) بھی اشد ضروری ہے۔

حکومت کے لیے غور طلب مسئلہ

اس ضمن میں جو مسئلہ حکومت کے لئے انتہائی غور طلب ہے اس کے دو پہلو ہیں داخلی اور خارجی۔

ا۔ داخلی پہلو

حکومت کے اندر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر ورسوخ رکھنے والے کئی ایسے افراد ہمیشہ سے موجود رہے ہیں جو بڑے معصومانہ انداز میں تجاہلِ عارفانہ کے مرتکب ہوتے ہوئے فرقہ پرستی کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ سرکاری سطح پر ترتیب دیئے جانے والے مختلف النوع دینی وفود، نصاباتِ تعلیم کو ترتیب دینے والی کمیٹیاں، مساجد اوقاف، مدارس اور دیگر سرکاری محاکم، کے لئے علماء، اساتذہ اور خطباء وغیرہ کی تقرریاں، اور دیگر بیسیوں معاملات ایسے ہیں جن کے فیصلے نچلی سرکاری سطحوں پر ہوتے ہیں اور ان کی تفصیلات حکاّمِ بالا کو براہِ راست معلوم نہیں ہوتیں۔ ان معاملات میں ہمیشہ کچھ فتنہ پرور ہاتھ یکطرفہ کاروائیوں میں ملوّث رہتے ہیں اس طرح جانبدارانہ سرکاری فیصلوں کے نتیجے میں دوسرے مسالک اور مکاتبِ فکر میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔ اور یہی اضطراب، فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دینے کا بنیادی سبب بنتا ہے۔ لہٰذا حکومت کی سیاسی

ذمہ داری ہے کہ وہ ان معاملات میں چشمِ بصیرت کھولے رکھے اور ایسے افراد کی دسترس سے سرکاری معاملات کو ہمیشہ بالا رکھے۔

۲۔ خارجی پہلو اس مسئلے کا خارجی پہلو یہ ہے۔ ملک کے بعض مذہبی طبقے اور جماعتیں، تبلیغ و اشاعتِ دین کے نام پر بعض بیرونی ممالک سے بے پناہ سرمایہ حاصل کرتی ہیں اس طرح مخصوص زاویہ نگاہ رکھنے والے بیرونی ممالک اپنے سرمایے کے ذریعے "اسلام" کے نام پر پاکستان میں فرقہ وارانہ ماحول کو تقویت پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں۔ جب حکومت کی عدم مداخلت کی بنا پر بعض مخصوص طبقے، فرقے، تنظیمیں اور مسلک بیرونی سرمایے سے روز بروز، سیاسی، تنظیمی، افرادی اور نیم فوجی، قوت بڑھاتے چلے جائیں اور وقتاً فوقتاً اس کا مظاہرہ بھی ہوتا رہے تو صاف ظاہر ہے۔ کہ اس مخصوص تعلق کے نتیجے میں دیگر طبقات کو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ہر سطح پر نقصان پہنچایا جائے گا۔ یہی وہ ذرائع اور وسائط ہیں جن کی بنا پر مسلمانوں کے مابین وحدت و یگانگت پیدا کرنے کی کوئی کوشش بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی۔

لہذا یہ حکومت کی انتہائی بنیادی اور نازک ذمہ داری ہے کہ تمام طبقات کے لئے کسی بھی نام پر بیرونی سرمایے کا حصول نہ صرف ممنوع اور غیر قانونی قرار دے بلکہ اس کا حصول عملاً ناممکن بنائے اور متعلقہ حکومتوں سے درخواست کرے کہ اگر وہ خدمتِ دین کے لئے پاکستان میں سرمایہ کاری کرنا چاہتی ہیں تو بجائے نجی اداروں اور تنظیموں کے خود حکومت کو سرمایہ فراہم کریں تاکہ اسے منصفانہ اور دیانتدارانہ طریق پر تقسیم کیا جا سکے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر حکومت اس مسئلے کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر بھرپور توجہ دے تو کافی حد تک حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

اسلام کے علمی، عملی، رُوحانی اور انقلابی پہلوؤں پر مشتمل

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی چند معرکۃ الآراء

تفسیر منہاج القرآن زیر تالیف

خطبات سیرت النبی و دروس تصوف زیر ترتیب و تدوین

١. تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)
٢. سورۂ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
٣. اسلامی فلسفۂ زندگی
٤. اجزائے ایمان (حصہ اول)
٥. اجزائے ایمان (حصہ دوم)
٦. اجزائے ایمان (مکمل) مجلد
٧. ایمان اور اسلام
٨. فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
٩. مناہج العرفان فی لفظ القرآن
١٠. بلا سُود بنکاری (عبوری خاکہ)
١١. منافقت اور اُس کی علامات
١٢. سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
١٣. معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
١٤. اجتہاد اور اُس کا دائرہ کار
١٥. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفۂ خودی
١٦. تاریخ فقہ میں ہدایہ و صاحب ہدایہ کا مقام
١٧. معارف اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
١٨. شہادت توحید
١٩. اسلام اور طب جدید
٢٠. اقبالؒ اور تصور عشق
٢١. اسلام اور سائنس
٢٢. تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
٢٣. حکمت استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم)
٢٤. فلسفۂ تسمیہ (تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)
٢٥. معارف اسم اللہ
٢٦. صفت رحمت کا شان امتیاز
٢٧. عصر حاضر اور فلسفۂ اجتہاد
٢٨. حصول مقصد کی جدّوجہد اور نتیجہ خیزی
٢٩. پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
٣٠. قرآنی فلسفۂ تبلیغ
٣١. فطرت کا قرآنی تصوّر
٣٢. پیغمبر انقلاب اور صحیفۂ انقلاب
٣٣. عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم (وقت کی اہم ضرورت)
٣٤. علم۔ توجیہی یا تخلیقی
٣٥. دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو
٣٦. مغربی اور اسلامی تصور قانون کا تقابلی جائزہ
٣٧. قرآنی فلسفۂ عروج و زوال
٣٨. نص اور تعبیر نص
٣٩. حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مُصلح سیاست
٤٠. قرآن اور شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

٤١_ Islam in Various Perspectives
٤٢_ Quranic Concept of Human Guidance
٤٣_ Islam and Freedom of Human Will
٤٤_ Islamic Concept of Human Nature
٤٥_ Quranic Basis of Constitutional Theory
٤٦_ Philosophy of Ijtihad and The Modern World
٤٧_ Islamic Concept of Crime
٤٨_ Islam-The State Religion
٤٩_ Islamic Philosophy of Punishments
٥٠_ Islamic Concept of Law
٥١_ Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
٥٢_ Islamic Philosophy of Human Life
٥٣_ Islam and Christianity
٥٤_ Islam and Modern Medicine
٥٥_ Finality of the Prophethood
٥٦_ What Islam is
٥٧_ Islamic Concept of Benevalence
٥٨_ Islam & Criminality
٥٩_ Legal Character Of Islamic Punishments
٦٠_ Classification Of Islamic Punishments
٦١_ Legal Structure Of Islamic Punishments

اسلام کے علمی و عملی، فقہی و قانونی اور اخلاقی و روحانی موضوعات پر پروفیسر صاحب کے قریباً ٣٠٠ مسودات ترتیب و تدوین یا طباعت کے مراحل میں ہیں۔

ملنے کا پتہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور، فون: ٦٣٤٦٤ ۔ ای پلومر۔ شاہراہ قائد اعظم بالمقابل ہائی کورٹ لاہور فون: ٥٢٠٩٦، المالک پلازہ B/6 نزد جہانگیر پارک ایمپریس مارکیٹ کراچی صدر فون: ٤٣٨٤٨٢